242-253

1997

زیر سرپرستی

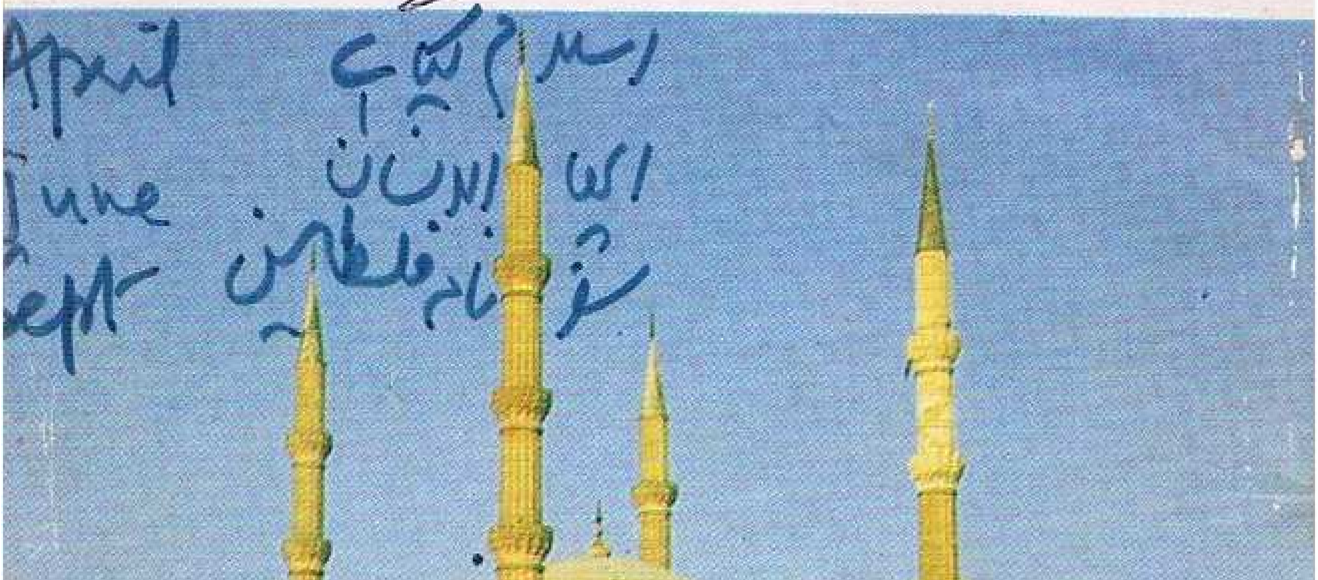
مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

الرسالہ

Al-Risala

January 1997 • No. 242 • Rs. 7



MOSQUE AT EDIRNE, TURKEY

صبر بامقصد انسان کا کردار ہے۔ بامقصد انسان اس کا

تحمل نہیں کرسکتا کہ وہ بے صبر اور بے برداشت ہو جائے

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۹۷، شمارہ ۲۴۲

فہرست

روزہ کیا ہے	۴	دو فرحتیں	۱۱
اللہ کی پکار	۵	داعی کی ذمہ داری	۱۲
اخلاقی پرہیزگاری	۶	زکوٰۃ کا مسئلہ	۱۴
روزہ اور دعا	۸	سفرنامہ یورپ ـــ ۲	۱۹
ہمدردی کا مہینہ	۱۰	خبرنامہ اسلامی مرکز ـ ۱۱۷	۴۶

AL-RISALA (Urdu)

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4611131 Fax: 91-11-4697333

Single copy Rs. 7, Annual subscription Rs. 70, Abroad: $ 20 (Air mail), $ 10 (Surface mail)

Printed and published by Saniyasnain Khan at Nice Printing Press, Delhi

Distributed in UK and USA by:

IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 7117, Fax: 0121-773 7771

MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

روزہ کیا ہے

روزہ خود انضباطی (self-discipline) کی مشق ہے۔ روزہ کے دنوں میں آدمی خود اپنے ارادہ اور فیصلے سے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد جب شام کا وقت آتا ہے تو دوبارہ وہ خود اپنے ارادہ اور فیصلہ سے کھانا کھاتا ہے اور پانی پیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو خود انضباطی کی زندگی گزارنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ سال کے ایک مہینہ میں کھانے پینے کے معاملہ میں روزہ دار بن کر وہ اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ سال کے بقیہ مہینوں میں وہ اپنے ہر معاملہ میں روزہ دارانہ زندگی گزار سکے۔

کائنات میں انسان کے سوا بے شمار چیزیں ہیں۔ یہ تمام کی تمام مکمل طور پر خدا کے تحت ہیں۔ ہر چیز اپنے اختیار کو ترک کر کے خدا کے قانون کی پابندی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ انسان اطاعت کی اس روش کو خود اپنے ارادہ سے اپنے لئے اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو خدا کا پابند بنالے۔

اسی خود اختیار کردہ پابندی کی تربیت کے لئے روزہ کا نظام مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کوئی سالانہ رسم نہیں، وہ ایک سالانہ تربیت ہے۔ روزہ وقتی طور پر بھوک پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں۔ روزہ مستقل طور پر صبر و برداشت کی زندگی گزارنے کا ایک سبق ہے۔

روزہ میں آدمی کے سامنے کھانا اور پانی ہوتا ہے مگر بھوک پیاس کے باوجود وہ ان کو نہیں لیتا۔ اسی طرح یہ مطلوب ہے کہ آدمی کو خدا کی مرضی کے خلاف چلنے کا موقع ہو مگر خواہش کے باوجود وہ ایسے راستہ پر نہ جائے۔ آدمی کے لئے گھمنڈ کرنے کا امکان پوری طرح موجود ہو، مگر چاہنے کے باوجود وہ گھمنڈ کو چھوڑ کر تواضع کا طریقہ اختیار کرلے۔ آدمی کے لئے بے انصافی کے دروازے کھلے ہوئے ہوں مگر طبیعت کے تقاضے کے باوجود وہ زیادتی اور بے انصافی سے دور رہے۔

انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس دنیا میں خود عائد کردہ پابندی کی ایک زندگی گزارے۔ روزہ میں یہ پابندی کھانے پینے کے معاملہ میں ہوتی ہے اور بقیہ زندگی میں یہ پابندی اخلاقی سلوک کے معاملہ میں۔

اللہ کی پکار

الترمذی اور ابن ماجہ کی ایک روایت روزہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کی خبر دی ان میں سے ایک یہ ہے کہ رمضان کا مہینہ جب آتا ہے تو اللہ کی طرف سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کے طالب آگے بڑھ اور اے شر کے طالب رک جا (ینادی مناد، یاباغیَ الخیر اقبل ویاباغی الشر اقصر) (مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۱)

ان الفاظ میں ایک نفسیاتی حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں جب ایک آدمی روزہ رکھتا ہے تو اس کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ اس کی مادی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے، اور اس کی روحانی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں، اس طرح فطری طور پر اس کے اندر ایک طلب ابھرتی ہے ـــــ نیکی کی طرف بڑھنے کی اور برائیوں سے دور بھاگنے کی۔

روزہ آدمی کی شخصیت کے حیوانی پہلو کو دباتا ہے۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے لطیف احساسات کو بیدار کرتا ہے۔ اس طرح آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے۔

روزہ ایک شدید تجربہ ہے۔ وہ آدمی کے معمولات کو توڑ دیتا ہے۔ آدمی کے صبح و شام غیر معمولی حالات میں بسر ہونے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کمزوری آتی ہے۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔ بے آرامی اور بے سکونی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

روزہ کا یہ پہلو آدمی کو موت اور آخرت کی یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کے اوپر محرومی اور بے لبسی کی جو کلی حالت پیش آنے والی ہے، روزہ گویا جزئی طور پر اسی محرومی اور بے لبسی کی پیشگی یاددہانی ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ آنے والے دن کو اس سے پہلے محسوس کرے جب کہ وہ بالکل سامنے آچکا ہو۔ وہ موت سے پہلے موت کے بعد کی تیاری کرنے میں لگ جائے۔

اخلاقی پرہیزگاری

حدیث میں رمضان کو شہر الصبر کہا گیا ہے (مشکاۃ المصابیح ۶۱۳/۱) یعنی صبر و برداشت کا مہینہ۔ اس مہینہ میں آدمی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے منفی جذبات پر قابو رکھتے ہوئے فتنوں کی اس دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکے۔ آدمی کے منفی جذبات ہی اس کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ اور روزہ اسی سب سے بڑے انسانی مسئلہ کے حل کی ایک مقدس تدبیر ہے۔

اس بات کو حدیث میں اس طرح کہا گیا ہے کہ ہر چیز کی ایک زکاۃ ہوتی ہے، اور جسم کی زکاۃ روزہ ہے (مشکاۃ المصابیح ۶۳۹/۱) یہاں زکوٰۃ سے مراد پاکی ہے۔ یعنی ہر چیز کو پاک کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور جسم کو پاک کرنے کے لئے روزہ کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ روزہ کی حیثیت جسم انسانی کے لئے غسل جیسی ہے۔ پانی کا غسل جسم کے ظاہری حصہ کو پاک کرتا ہے، اور روزہ جسم کے باطنی حصہ کو پاک کرنے والا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لئے بلایا جائے اور وہ روزہ دار ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں (اذا دعی احدکم الی طعام وھو صائم فلیقل انی صائم) مشکاۃ المصابیح ۶۴۱/۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ بری بات بولے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہو تو اس کو یہ کہہ دینا چاہئے کہ میں روزہ دار ہوں۔ (مشکاۃ المصابیح ۶۱۱/۱)

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی عملی پرہیز کی حالت اپنے آپ پر طاری کرے۔ اس طرح اس کے اندر ایک قسم کی پرہیزی فکر ابھرتی ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کہ دنیا میں مجھے پرہیز والی زندگی گزارنا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی اسے کھانے کی کوئی چیز پیش کرے تو وہ فوراً کہہ دیگا کہ میں روزہ دار ہوں۔ کوئی اس کو برا کہے یا اس کے ساتھ اشتعال انگیزی کرے تو اس کے جواب میں وہ مشتعل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس کا دل اس کے اندر سے کہہ رہا ہوگا کہ تم نے تو روزہ رکھ کر پرہیزگار بننے

کا عہد کر رکھا ہے۔ تم کیسے برائی کے فعل میں کسی کے ساتھ شریک ہو سکتے ہو۔

اس طرح روزہ آدمی کے اندر یہ مزاج بناتا ہے کہ وہ غیر انسانی باتوں سے پرہیز کرے۔ وہ غیر شریفانہ قسم کے قول و فعل سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ اخلاقی پرہیز کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنے لگے۔

یہ پرہیزگاری ہی موجودہ دنیا میں ہر قسم کی دینی اور دنیوی ترقی کی واحد ضمانت ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کے لئے بسایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں طرح طرح کی آزمائشی ترغیبات بھی رکھ دی گئی ہیں تاکہ اس کے ذریعے آدمی کو جانچا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ کون آزمائش میں پورا اترا، اور کون آزمائش میں ناکام ہو گیا۔

سب سے پہلے آدمی کا اپنا نفس ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بہت سے ناپسندیدہ جذبات پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ مثلاً حسد، غصہ، نفرت، بغض، خود غرضی، مفاد پرستی، خود بینی، مصلحت پرستی اور انانیت وغیرہ۔ جب کوئی موقع آتا ہے تو یہ جذبات ابھرتے ہیں اور آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی اسی پرہیزگاری کے اصول پر عمل کرے جس کی تربیت ایک اضافی کورس کے ذریعہ رمضان کے مہینہ میں اس کو دی گئی ہے۔

اسی طرح شیطان بار بار آدمی کو بہکاتا ہے۔ انسانی پروپگنڈے اس کو غلط سمت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ عمومی رواج آدمی کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ان تمام مواقع پر آدمی گمراہی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وقت جو آدمی پرہیزگاری کا اصول اختیار کر کے اپنے کو انحراف سے بچا لے وہ کامیاب ہے، اور جو شخص ایسا نہ کر سکے وہ دنیا میں بھی ناکام ہے اور آخرت کی طویل تر زندگی میں بھی ناکام۔

"پرہیز" ایک مستقل اصول ہے۔ اور روزہ اسی پرہیز کے اصول کا ایک سبق ہے۔ روزہ دار وہی ہے جس کا روزہ اس کو پرہیزگارانہ زندگی گزارنے کے قابل بنا دے۔

روزہ اور دعا

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں رمضان کے روزہ کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ عین اسی کے درمیان دعا کی آیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ : اور جب میرے بندے تم سے میری بات پوچھیں تو میں بالکل قریب ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں۔ امید ہے کہ وہ ہدایت پائیں گے (البقرہ ۱۸۶)

یہ ترتیب بتاتی ہے کہ روزہ اور دعا کے درمیان خاص تعلق ہے۔ روزہ دار انسان عین اسی وقت ایک دعاگو انسان ہوتا ہے۔ روزہ دعا کے ساتھ خصوصی مناسبت رکھتا ہے۔

دعا کیا ہے۔ دعا تڑپتے ہوئے دل کی پکار ہے۔ وہ نفسیاتی سوز کا ایک لفظی اظہار ہے۔ روزہ یہی تڑپ اور یہی سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔ روزہ آدمی کے اندر اخبات کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس سے آدمی کے اندر سچی دعا ابلنے لگے۔

شام کو روزہ کی تکمیل کے وقت جب آدمی یہ کہتا ہے کہ خدایا، میں نے تیرے حکم سے روزہ رکھا، اور تیرے حکم سے میں نے افطار کیا، تو یہ صرف کچھ الفاظ نہیں ہوتے۔ یہ دراصل ایک روحانی تجربہ ہوتا ہے جو لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح مہینہ بھر روزہ آدمی کے اندر عجز و گداز کی کیفیات پیدا کرتا ہے اور اس کے تحت آدمی بار بار خصوصی دعاؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کا مہینہ پورا ہو جاتا ہے، اس وقت خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ خدایا، تو میرے بقیہ تمام مہینوں کو روزہ کے اس مبارک مہینہ کے تابع کر دے۔ خدایا، میں نے تیرے حکم کی تعمیل کر دی، اب تو بھی میری دعاؤں کو قبول کر لے۔

روزہ گویا دعا کی تیاری ہے۔ روزہ آدمی کو چارج کرتا ہے تاکہ وہ حقیقی طور پر دعا کے قابل ہو سکے۔ وہ مطلوب کیفیات کے ساتھ خدا کو پکارنے لگے۔

خدا اپنے بندوں سے قریب ہے، ہر چیز سے زیادہ قریب۔ خدا اپنے بندے سے اتنا زیادہ قریب ہے کہ وہ ان کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن میں خدا کا یہ تعارف کسی بندے کے لئے بے حد سکون بخش ہے کہ وہ اپنے رب کو براہ راست پکار سکتا ہے، وہ اپنے رب سے براہ راست اپنا مدعا بیان کر سکتا ہے۔

خدا بلاشبہ اپنے بندوں کے قریب ہے۔ مگر یہ قربت کسی بندے کے لئے ذاتی واقعہ اسی وقت بنتی ہے جبکہ اس پر بندگی کے حقیقی تجربات گزریں۔ جب اس پر احتیاج کی حالت طاری ہو۔ روزہ آدمی کو اسی موافقِ دعا تجربہ سے گزارتا ہے۔ وہ قربت خداوندی کی کیفیات پیدا کر کے آدمی کو سچا دعاگو بناتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعا احساس بندگی کے تحت نکلنے والے الفاظ کا نام ہے، اور روزہ اسی احساس بندگی کو پیدا کرنے کی سالانہ تربیت۔ پانی کو نعمت کے طور پر محسوس کرنا اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آدمی کو پیاس لگے اور ٹھنڈا پانی اس کی رگوں کو تر کر دے۔ جس آدمی پر پیاس کا تجربہ نہ گزرے وہ پانی کی نعمت کا احساس بھی نہیں کر سکتا۔

روزہ آدمی کے اندر پیاس پیدا کرتا ہے تاکہ جب وہ پانی پیئے تو وہ پانی کی نعمت پر سچا شکر ادا کر سکے۔ روزہ آدمی کو احتیاج کی حالت کا احساس دلاتا ہے، تاکہ جب اس کی احتیاج پوری ہو تو وہ بھرپور کیفیات کے ساتھ کہہ سکے کہ خدایا، تیرا شکر ہے کہ تو نے میری ضرورتوں کی تکمیل کا اتنا اعلیٰ انتظام فرمایا۔

ہمدردی کا مہینہ

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان کا مہینہ شہر المواساۃ ہے۔(مشکاۃ المصابیح ۱/۶۱۳) یعنی لوگوں کی مدد کرنے اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مہینہ۔ یہ روزہ کا وہ پہلو ہے جس کو انسانی پہلو کہا جاسکتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کے مہینہ میں بہت زیادہ صدقہ کرتے تھے۔ اس مہینہ میں کوئی بھی سوال کرنے والا آپ کے یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ روزہ کے مہینہ میں جو شخص کسی کو کھلائے تو وہ اس کے لئے مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی روزہ دار کو کھلائے گا تو وہ بھی اس روزہ کے ثواب میں شریک ہو جائے گا (۶۲۱)

روزہ کے مہینہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آدمی بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ کرتا ہے۔ یہ تجربہ امیر اور غریب دونوں کو یکساں طور پر ہوتا ہے۔ یہ تجربہ صرف ایک بار وقتی طور پر نہیں ہوتا بلکہ مسلسل ایک مہینہ تک ہر روز اس کو اس خصوصی کورس سے گزارا جاتا ہے۔

اس طرح روزہ ہر آدمی کو یہ تجربہ کراتا ہے کہ انسانی ضرورتیں کیا ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ پیاس کیا ہے اور بھوک کیا چیز ہے۔ جو لوگ عام حالات میں بھوک پیاس کو محسوس نہیں کرپاتے وہ بھی رمضان کے مہینہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ کرلیتے ہیں۔ اس طرح روزہ ہر آدمی کو ایک سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ امیر آدمی بھی کچھ دیر کے لئے اسی حالت پر پہنچ جاتا ہے جس حالت پر ایک غریب آدمی جی رہا تھا۔

اس طرح ہر آدمی کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے۔ ہر آدمی دوسروں کے احساس میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھرآتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضرورت میں ان کے کام آئے۔ وہ بقدر استطاعت دوسروں کی مدد کرے۔ اس طرح روزہ ایک دوسرے کی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیتا ہے جو رمضان کے بعد بھی مہینوں تک باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سال بھر پورا ہوکر پھر دوسرا رمضان آجاتا ہے جو دوبارہ آدمی کے اندر وہی انسانی جذبات ابھار دے۔

دو فرحتیں

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : للصائم فرحتان. یفرحهما۔ اذا افطر فرح و اذا لقی ربہ فرح بصومہ۔ یعنی روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں جن سے وہ خوش ہوگا۔ جب وہ افطار کرتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے رب سے ملے گا تو اپنے روزہ کے انعام پر خوش ہوگا (فتح الباری ۴/ ۱۴۱ ، صحیح مسلم بشرح النووی ۸/ ۳۱)

روزہ دار دن بھر بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ اس کے بعد شام کو جب وہ افطار کرتا ہے اور کھانا اور پانی اس کے جسم میں داخل ہوتا ہے تو قدرتی طور پہ اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ پھر موت کے بعد آخرت میں جب یہ روزہ دار اللہ سے ملے گا اور اللہ اس کی روزہ داری کے بدلے میں اس کو جنت میں داخل کرے گا تو اس وقت مزید اضافہ کے ساتھ اس کو کامل خوشی حاصل ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ روزہ دنیا کی زندگی کی علامت ہے اور افطار آخرت کی زندگی کی علامت۔ دنیا میں مومن کو ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے اور قربانیوں کو برداشت کرنا ہے۔ لذتوں سے محروم ہو کر اس کو خدا کی اطاعت کرنا ہے۔ مگر آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا۔ وہاں اس کے لئے خوشیاں ہی خوشیاں ہیں اور وہاں اس کے لئے آرام ہی آرام۔ اس طرح روزہ علامتی طور پر مومن کی دنیا کا تعارف ہے، اور افطار علامتی طور پر مومن کی آخرت کا تعارف۔

دنیا کی زندگی، مومن کے لئے فاقہ کی زندگی ہے، اور آخرت کی زندگی، مومن کے لئے اکل و شرب کی زندگی۔ دنیا میں مومن کے لئے ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں ہیں، اور آخرت میں مومن کے لئے انعام ہی انعام۔

روزہ آدمی کو احساس دلاتا ہے کہ دنیا میں اسے قربانیوں کی حد تک جا کر اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اور افطار کی صورت میں اس کو یہ تجربہ کرایا جاتا ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جبکہ اس کا خدا اس طرح کی قدر دانی کرے گا کہ اس کو ابدی جنتوں میں داخل کر دے گا جہاں ہر قسم کی لامحدود خوشیاں اور لذتیں بھی ہوں گی، اور اسی کے ساتھ ان سے بہرہ اندوز ہونے کی مکمل آزادی بھی۔

داعی کی ذمہ داری

قرآن (البقرہ ۱۴۳) میں امت محمدی کو امت وسط کہا گیا ہے۔ فرمایا کہ اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا، تاکہ تم گواہ ہو لوگوں کے اوپر اور رسولؐ تمہارے اوپر گواہ ہو (وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا)

وسط کے معنی درمیان کے ہیں مثلاً ایک لائن میں ایک، دو، تین لکھا جائے تو دو اس کا درمیانی عدد ہوگا۔ قرآن میں نماز عصر کو صلاۃ وسطی کہا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ رات کی دو نمازوں اور دن کی دو نمازوں کے درمیان ہے (لِانّھا وسَطٌ بین صلاتَیِ اللیل وصلاتَیِ النھار) لسان العرب ۷/۴۳۰

اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت وشہادت کے اعتبار سے امت محمدی کا رول ایک درمیانی رول ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اس کو خدا کا دین ملا۔ اب اسے قیامت تک نیابۃً امر دین کو اہل عالم تک پہنچاتے رہنا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوام عالم کے درمیان ہے (ھم وسط بین النبی صلے اللہ علیہ وسلم وبین الامم) تفسیر الطبری ۲/۸

اس اعتبار سے گویا مسلمان کی حیثیت ایک قسم کے درمیانی آدمی (middle-man) کی ہے۔ ایسا آدمی اپنا درمیانی کردار اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب کہ وہ طرفین کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ اسی لیے قرآن میں پیغمبر کے بارہ میں آیا ہے کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارے لیے ناصح اور امین ہوں (ابلّغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین) الاعراف ۶۸

یعنی خدا کی نسبت سے امین اور انسانوں کی نسبت سے ناصح۔ ناصح کا مطلب خیر خواہ ہے۔ نصح کا لفظ غش (بدخواہی) کا ضد ہے۔ نصیحت کی تشریح میں ابن الاثیر نے کہا کہ یہ مخاطب کے لیے بہتری چاہنا ہے (ھی ارادۃ الخیر للمنصوح لہ)۔ النابغہ کا شعر ہے کہ میں نے بنو عوف سے ان کی خیر خواہی کی بات کہی مگر انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا:

نصحتُ بنی عَوف فلم یتقبّلُوا (لسان العرب ۲/۶۱۵-۶۱۶)

امین کا لفظ خائن کا ضد ہے۔ یعنی امانت دار۔ یہاں امین کا مطلب یہ ہے کہ میں عین وہی بات تم کو بتا رہا ہوں جو مجھ کو خدا سے ملی ہے۔ میں نے اس میں کچھ بھی فرق نہیں کیا ہے۔ خدا نے اپنے دین کا

جو علم مجھے عطا کیا ہے، پوری امانت داری کے ساتھ عین وہی علم میں تم کو پہنچا رہا ہوں۔

مخاطب قوم کے لیے ناصح بننے کا معیار قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ داعی اپنی مدعو قوم سے کسی بھی قسم کے اجر کا طالب نہ ہو۔ پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا: یا قوم لا اسئلکم علیہ اجراً (ھود ۵۱) یہ بے حد اہم بات ہے۔ کیوں کہ داعی اگر اپنے مدعو سے کسی بھی قسم کا اجر چاہے تو اس کی خیر خواہانہ حیثیت مشتبہ ہو جائے گی۔

امین ثابت ہونے کا معیار یہ ہے کہ داعی اپنے مدعو سے وہی کہے جو اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی کمی یا بیشی یا تبدیلی نہ کرے۔ قرآن میں ہے کہ پیغمبر نے اپنی قوم سے کہا: انی رسول من رب العالمین۔ حقیق علیٰ ان لا اقول علی اللّٰہ الا الحق (الاعراف ۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ میں خدا پر نہ لگاؤں مگر وہی بات جو واقعہ ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے ٹھیک ٹھیک پیغام رسانی کروں۔

امین اور ناصح —— یہ دو لفظ داعی کی پوری شخصیت کو بتاتے ہیں۔ داعی کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دین خدا کے معاملہ میں پوری طرح امین بنے، اور مدعو کی نسبت سے وہ پوری طرح اس کا خیر خواہ ثابت ہو۔ ان دونوں ذمہ داریوں میں سے کسی ایک میں بھی اگر کمی واقع ہو تو دعوت کا عمل حقیقی طور پر انجام پانا ناممکن ہو جائے گا۔

دین خدا کے معاملہ میں امین بننے کے لیے اس کو ایسا ذہن بنانا ہے جو ہر قسم کے تعصب سے پاک ہو، تاکہ وہ دین کو اس کی صحیح صورت میں سمجھ سکے۔ اور مدعو یا خدا کے بندوں کے معاملہ میں اس کو انتہائی حد تک صابر و شاکر بننا ہے تاکہ لوگوں کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہو تب بھی وہ خیر خواہی اور ہمدردی کی روش سے نہ ہٹے۔ وہ لوگوں کے ردعمل سے بے نیاز ہو کر ان کی اصلاح و نجات کا حریص بنا رہے۔

زکوٰۃ کا مسئلہ

اسلام کی ایک اہم تعلیم زکاۃ ہے۔ قرآن میں اس کو دین قیم کا ایک رکن قرار دیا گیا ہے (البینہ ۵) اور اس کو تطہیر و تزکیہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ (التوبہ ۱۰۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من کنز ھا فلم یؤدّ زکا تھا فویل لہ۔ یعنی اس آدمی کے لئے خرابی ہے جو مال کو جمع کرے اور اس کی زکاۃ ادا نہ کرے۔ (ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ) خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا کہ زکاۃ مال کا حق ہے: فان الزکاۃ حق المال (فتح الباری ۱۲/۲۸۸)

قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں زکاۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک آیت میں زکوٰۃ کے خرچ کی تفصیلی مدیں بتائی گئی ہیں:

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم (التوبہ ۶۰)

صدقات تو فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں اور ان کارکنوں کے لئے جو صدقات کے اوپر مقرر ہیں اور ان کے لئے جن کی تالیف قلب مطلوب ہے۔ اور گردنیں چھڑانے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں، اور اللہ کے راستہ میں اور مسافر کی امداد میں۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔

زکوٰۃ ایک عبادت ہے۔ ادائگی کے اعتبار سے وہ اسی طرح ایک شخصی عمل ہے جس طرح نماز ایک شخصی عمل ہے۔ البتہ اسلام میں عبادات کو اجتماعی زندگی سے جوڑ دیا گیا ہے تاکہ اس کا فائدہ پورے سماج تک وسیع ہو سکے۔ یہی معاملہ زکوٰۃ کا بھی ہے۔ زکوٰۃ ایک فرد اپنے مال سے نکالتا ہے مگر اس کے خرچ کی مدیں اس طرح مقرر کی گئی ہیں کہ اس کا فائدہ پورے سماج کو اور تمام انسانیت کو پہنچ سکے۔

سورہ توبہ کی اس آیت میں "صدقات" کا لفظ ہے۔ اکثر علماء نے اس سے زکوٰۃ مراد لی ہے۔ تاہم کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ قرآن نے جب زکوٰۃ کا لفظ چھوڑ کر یہاں صدقات کا لفظ استعمال کیا ہے

تو ہمیں اس سے زکوٰۃ سمیت تمام مالی عطیات کو مراد لینا چاہئے۔

آیت میں کل آٹھ مدوں کا ذکر ہے مگر ان میں ایک فرق ہے۔ ابتدائی چار مدوں کا ذکر ل (لئے) کے حرف کے ساتھ ہے اور بعد کی چار مدوں کا ذکر فی (میں) کے حرف کے ساتھ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ۴ مدوں میں شخصی تملیک مراد ہے، یعنی انفرادی طور پر کسی کو دینا۔ اور بقیہ چار مدوں میں شخصی تملیک کے ساتھ اجتماعی مد بھی شامل ہے۔ مثلاً ابن السبیل (مسافر) کو شخصی طور پر بھی صدقات کی رقم دی جاسکتی ہے اور مسافر خانہ جیسی تعمیر میں بھی اس کو خرچ کیا جاسکتا ہے جس سے مسافروں کو فائدہ پہنچے۔

سبیل اللہ (اللہ کے راستہ) کی نوعیت متعین کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ علماء کی ایک تعداد کا کہنا ہے کہ اس میں بھی تملیک ضروری ہے۔ یعنی کسی فرد واحد ہی کو دیا جائے گا نہ کہ کسی اجتماعی مد میں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ انفرادی تملیک اور اجتماعی مد دونوں میں دینا جائز ہے۔

سبیل اللہ سے کیا مراد ہے، اس میں بھی علماء میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد (بمعنی قتال) ہے۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں، اس میں تمام امور خیر شامل ہیں۔ مثلاً حج، طلب علم، وغیرہ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر امام رازی)

آیت کے الفاظ سے واضح ہے کہ سبیل اللہ کو جہاد (بمعنی قتال) سے مخصوص کرنا صرف استنباطی ہے، وہ خود الفاظ قرآن سے براہ راست طور پر نہیں نکلتا۔ بعض احادیث کی بنیاد پر علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ سبیل اللہ کا تعلق صرف قتال سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک عام حکم ہے۔

مثال کے طور پر صحیح البخاری (کتاب الدیات، باب القسامہ) کی ایک روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ابن حجر العسقلانی نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے اس کو ظاہر الفاظ پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض نے بعض علماء کی رائے نقل کی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو مصالح عامہ میں خرچ کرنا جائز ہے۔ انھوں نے اپنی رائے کے حق میں اس حدیث سے اور کچھ دوسری حدیثوں سے استدلال کیا ہے۔

وقد حمله بعضهم علىٰ ظاهره۔ فحكى القاضي عياض عن بعض العلماء جواز صرف الزكاة فى المصالح العامة واستدل بهٰذا الحديث وغيره (فتح الباري ۱۲/۲۴۴)

مزید تفصیل کے لئے سورۃ التوبہ آیت ۶۰ کے تحت حسب ذیل تفسیروں میں دیکھا جاسکتا ہے:

۱۔ التفسیر الکبیر، الرازی م ۶۰۶ھ
۲ الجامع لاحکام القرآن، القرطبی م ۶۷۱ھ
۳ البحر المحیط، ابو حیان م ۷۴۰ھ
۴ روح المعانی، آلوسی م ۱۲۷۰ھ

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سبیل اللہ کا لفظ سبیل دین کے معنی میں ہے۔ نہ کہ سبیل قتال کے معنی میں۔ اس میں ہر وہ دینی کام شامل ہے جس کے لئے مالی اعانت کی ضرورت ہو۔

جہاد کے معنی صرف کوشش کے ہیں نہ کہ قتال کے۔ چنانچہ ہر دینی کام کے لئے کوشش کرنا جہاد ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے بڑا جہاد دعوت دین میں کوشش کرنا ہے (وجاهدهم به جهادا كبيرا) اس لحاظ سے سبیل اللہ کی مد میں دعوت دین اور اشاعت اسلام کا کام خصوصی اہمیت کے ساتھ شامل ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ دین کا اظہار ہر حال میں اور ہمیشہ مطلوب ہے۔ البتہ زمانہ کے حالات کے اعتبار سے اس کی ترجیحات میں فرق ہوسکتا ہے۔ مثلاً قدیم مکہ جیسے حالات ہوں تو سبیل اللہ سے مراد سب سے زیادہ دعوت اور اشاعت اسلام کا کام ہوگا۔ اور اگر فریق ثانی کی عملی جارحیت کے نتیجہ میں دفاع کی ضرورت پیش آجائے تو دفاع میں خرچ کرنے کی اہمیت وقتی اعتبار سے بڑھ جائے گی۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں اسلام کو مختلف طاقتوں کی طرف سے چیلنج درپیش ہے۔ یہ چیلنج جنگی نہیں ہے بلکہ علمی ہے۔ آج اسلام کا سب سے بڑا دفاعی مسئلہ علم کے میدان میں پیش آرہا ہے۔ اس لئے اسلام کے علمی دفاع کے محاذ پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کرنا دوگونہ اہمیت کا حامل ہے۔ ایک یہ کہ وہ دعوت اسلام کا کام ہے، دوسرے یہ کہ وہ اسلام کا دفاعی کام بھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت تک میری امت میں ایسا گروہ ہوگا جو جہاد کرتا رہے گا۔ اس کی تشریح امام بخاری نے یہ کی ہے کہ وهم اهل العلم (اور وہ اہل علم ہیں) (فتح الباری

بشرح صحیح البخاری ۱۳/۳۰۶۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کی راہ سے اسلام کی اشاعت کرنا یا اسلام کا دفاع کرنا سبیل اللہ کا سب سے بڑا کام ہے۔ اور صدقات (زکوٰۃ) کی رقم کا اس مد میں خرچ کیا جانا، خاص طور پر موجودہ زمانہ میں، اس کی سب سے اہم مد ہے۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ دین کے اکثر مسائل میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مدوں کے معاملہ میں بھی علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خود دور اول میں صحابہ و تابعین کے درمیان کثرت سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ یہی ابتدائی اختلاف بعد کے علماء تک منتقل ہو گیا۔ علماء ہی نے لکھا ہے کہ یہ اختلاف امت کے لئے عین رحمت ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے دین میں توسع کی صفت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس بنا پر ہمارے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں شرعی احکام کو از سر نو منطبق کر سکیں۔ اور ہر دور کے حالات میں اس کے موافق کوئی نہ کوئی حکم یا کسی نہ کسی کا قول پا لیں۔ یہ دین اسلام کی ابدیت اور ہمہ گیریت کا ایک یقینی ثبوت ہے۔

خلاصۂ کلام

قرآن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو کن مدوں میں خرچ کیا جائے۔ یہ کل آٹھ مدیں ہیں —— فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، رقاب، غارمین، سبیل اللہ ابن السبیل (التوبہ ۶۰)

ان میں سات مدیں حاجاتی مدیں ہیں، اور ایک مد (سبیل اللہ) وہ ہے جس کو تحریکی مد کہا جا سکتا ہے۔ حاجاتی مد سے مراد وہ مد ہے جو شخصی ضرورت سے تعلق رکھتی ہے۔ مختلف اسباب کے تحت کوئی شخص کبھی وقتی طور پر اور کبھی مستقل طور پر معاشی اعتبار سے ضرورت مند بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کے فنڈ سے مالی مدد فراہم کی جانی چاہئے۔

سبیل اللہ کی مد ایک تحریکی مد ہے۔ یعنی اسلام کو ایک دینی مشن اور فلاح انسانیت کی ایک اسکیم کی حیثیت سے جاری کرنا اور اس سلسلہ میں جو ضرورتیں پیش آتی ہیں، ان کو مالی تعاون دینا۔ یہ سبیل اللہ (اللہ کے راستہ) میں خرچ کرنا ہے۔ بقیہ مدیں اگر انسانی ضرورت سے تعلق

رکھتی ہیں تو اس مد کا تعلق خود اسلام کی اپنی ضرورت سے ہے۔ سبیل اللہ کی یہ مد زکوٰۃ کی آٹھ مدوں میں سے ایک اہم مد ہے۔

تحریکی مد سے مراد ہے —— دعوہ ورک، اسلام کی مشنری ضرورتیں، اسلام کی اشاعتی مہم، اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب، اسلام کو طاقت ور نظریہ کی حیثیت سے پیش کرنا، اسلام پر حملوں کا دفاع۔ یہ تمام مدیں وہ ہیں جو اسلام کو بطور ایک عالمی مشن کے اٹھانے کی صورت میں پیش آتی ہیں۔ اور وہ اسلام کی نظریاتی برتری کو مسلسل قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

یہ ایک نہایت اعلیٰ کام ہے اور اس میں بے حد ثواب ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کو قرآن میں خدا کی نصرت (الصف ۱۴) کہا گیا ہے اور اس کے لئے محنت کرنے کو جہاد کبیر (الفرقان ۵۲) بتایا گیا ہے۔ یعنی خدا کے دین کو پھیلانے کے لئے اور اس کو دنیا میں اونچا کرنے کے لئے اپنی طاقتوں کو لگانا۔ اس کام میں اہل اسلام کو ہر طرح تعاون پیش کرنا چاہئے۔ اس کی خصوصی اہمیت کی بنا پر زکوٰۃ فنڈ کا ایک حصہ اس کے لئے خاص کر دیا گیا ہے تاکہ ہر حال میں اور ہر دور میں اس کو مالی تعاون ملتا رہے اور وہ مسلسل جاری اور قائم رہے۔

(۲۸ جنوری ۱۹۹۶)

۲۲ اکتوبر کو صبح ساڑھے دس بجے دوبارہ ڈاکٹر لیونارڈو کے ساتھ فلارنس دیکھنے کے لئے نکلا۔ ہم لوگ اس پہاڑی پر گئے جس کو یہاں سبس ٹیس (S. Sebastieus) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت خوبصورت مقام ہے۔ اس کو سیاحوں کے اعتبار سے ڈولپ کیا گیا ہے۔ یہاں سے فلارنس کا بیشتر حصہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ آفاقی انداز کا ایک خوبصورت منظر تھا۔ یہاں مختلف ملکوں کے سیاح مرد اور عورت نظر آئے۔ سینٹ سیبس ٹیس ایک مسیحی تھے جن کو ۲۸۸ میں مذہبی بنیاد پر قتل کر دیا گیا۔

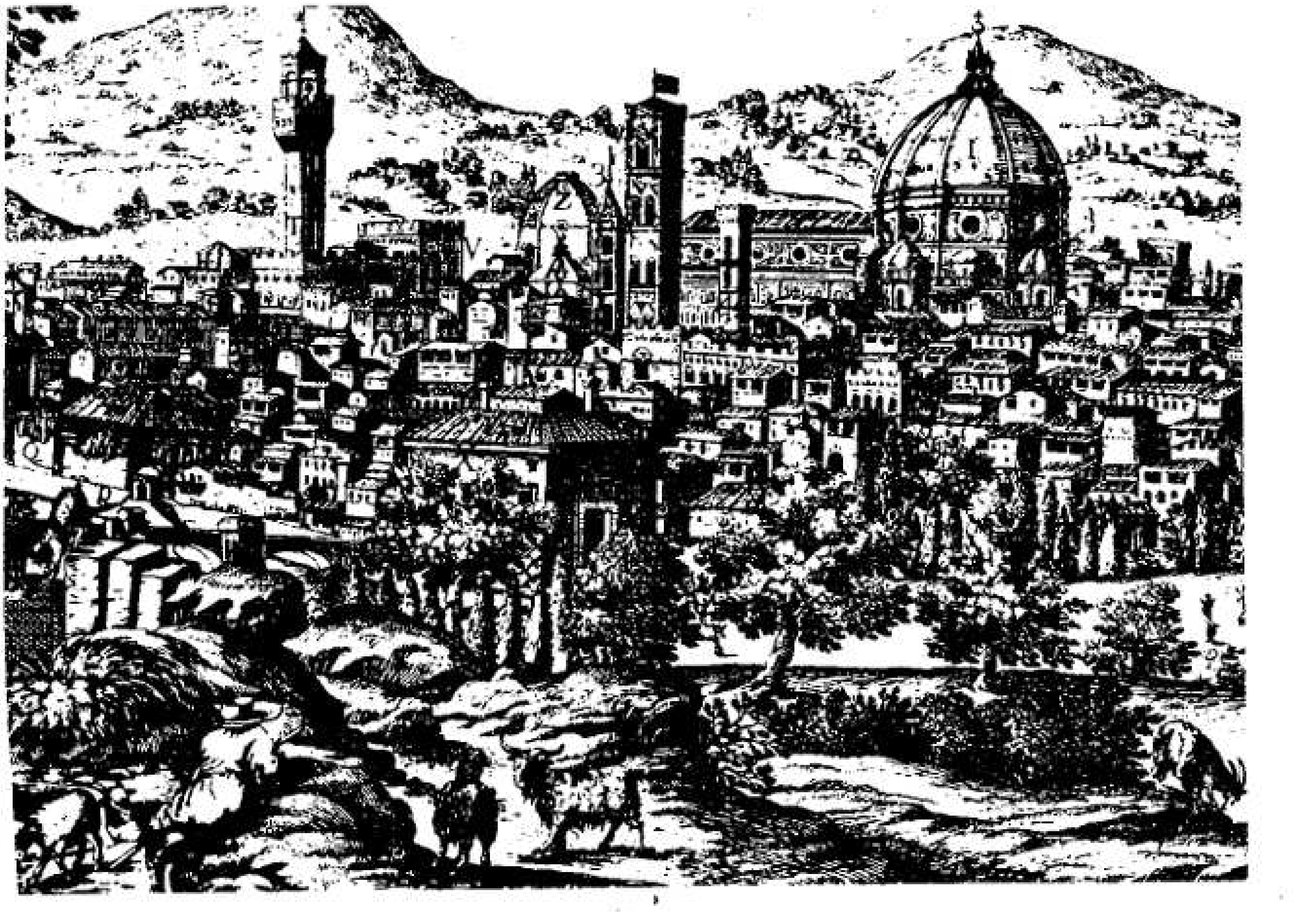
یہاں سے فلارنس کا پھیلا ہوا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سورج کی آفاقی ٹارچ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ بمبئی کی طرح کثیر منزلہ عمارتیں کہیں نظر نہیں آئیں۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ لوگ اپنی تاریخی روایات کو قائم رکھنے کے معاملہ میں نہایت حساس ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ ملٹی اسٹوری بلڈنگیں نہیں بناتے۔

جگہ جگہ فلارنس کے چرچ ابھرے ہوئے نظر آئے۔ اتنے میں ایک چرچ سے گھنٹہ کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ پوچھنے پر میرے اطالوی ساتھی نے بتایا کہ چرچ کے گھنٹے مختلف مواقع پر بجائے جاتے ہیں۔ مثلاً عبادت کے لئے۔ کسی کی موت کے اعلان کے لئے یا کسی تقریب کے لئے۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ آوازیں مقرر ہیں۔ جب چرچ سے گھنٹہ کی آواز سنائی دیتی ہے تو آواز کے فرق سے لوگ جان لیتے ہیں کہ یہ کس بات کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

تمام چرچوں میں صرف ایک ٹاور دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آجکل نئی مسجدوں میں ایک مینار بنانے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ یہ غالباً چرچ کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان کثرت سے یورپ کے شہروں میں گئے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ چرچ میں عام طور پر ایک ٹاور ہوتا ہے۔ یہ بات انھیں تصور توحید کے مطابق نظر آئی۔ اور انھوں نے اس کو اپنے حسب حال پاکر اسے اختیار کر لیا۔

یورپ کے ایک نوجوان ڈاکٹر سے گفت گو ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے یہاں تقریباً صد فی صد لو میرج ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیشتر شادیاں تفریق پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں اکیلے کی زندگی گزارتے ہیں۔ انھوں نے مختلف وجہیں بیان کیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقت

میں وہ محبت نہیں ہوتی۔ بلکہ سطحی کشش سے قریب ہو کر دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ وغیرہ۔
میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ مرد فطری طور پر غلبہ کا رجحان رکھتا ہے۔ شادی کے بعد ابتدائی کچھ دنوں تک اس کا یہ رجحان دبا رہتا ہے۔ مگر جلد ہی یہ رجحان ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اب شوہر چاہتا ہے کہ وہ گھر میں غالب ممبر کی حیثیت سے رہے۔ دوسری طرف عورت فیمنسٹ تحریکوں کے زیر اثر (نہ کہ فطرت کے زیر اثر) عورت اور مرد کی مساوات (gender equality) کے نظریہ کے مطابق رہنا چاہتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو بالآخر تفریق اور طلاق پر ختم ہوتا ہے۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق کیا۔
پھر میں نے کہا کہ اس سلسلہ میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ شادی سے پہلے جب ایک نوجوان کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے تو ابتدائی تاثر کے تحت وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ میرے لئے پرفکٹ عورت ہے۔ مگر اس دنیا میں کوئی چیز پرفکٹ نہیں۔ اور اسی طرح کوئی عورت (یا مرد) بھی پرفکٹ نہیں۔ جلد ہی مرد کے اوپر یہ حقیقت کھل جاتی ہے۔ اب وہ اپنی پسندیدہ خاتون کو کم تر سمجھ کر اس سے بے رغبت ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے دور



ہو جاتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل طلاق یا دوسرا نکاح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ آپ یہ جانیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز آئیڈیل یا پرفکٹ نہیں۔ یہاں ہر معاملہ میں ہمیں غیر آئیڈیل یا غیر پرفکٹ کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کرتے ہوئے زندگی گزارنا ہے۔ گویا کامیاب زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے نہ کہ ناکام طور پر کامل کو تلاش کرنے میں جو کبھی ملنے والا نہیں۔ انھوں نے میری اس بات سے بھی مکمل اتفاق کیا۔

۲۲ اکتوبر کو ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مروجہ نیت کے بجائے یہ الفاظ میری زبان پر آ گئے: یا اللہ میں تجھ سے امید رکھتا ہوں کہ جب میں مر کر آخرت کی دنیا میں پہنچوں تو میرے بارہ میں تو کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو میرے لئے سجدہ کر کے اور میرے لئے رکوع کر کے یہاں آیا ہے۔۔۔

نماز کے بعد اپنے ساتھی کے ہمراہ شہر کی بڑی مناسٹری میں پہنچا۔ یہاں کے وسیع ہال میں انسانوں کا ہجوم تھا۔ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ اس غیر معمولی ہجوم کو دیکھ کر خیال آیا کہ جب اتنے سارے لوگ امن کے خواہش مند ہیں تو دنیا میں امن قائم کیوں نہیں ہوتا۔ دل نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں ہی نہیں جو دنیا میں بد امنی پھیلائے ہوئے ہیں۔ گویا امن پسند لوگ آپس میں امن کی باتیں کر رہے ہیں۔

اس طرح کی تمام کانفرنسیں، خواہ وہ ملکی ہوں یا بین اقوامی وہ سب نو پرابلم انسانوں کے اجتماع کے ہم معنی ہوتی ہیں۔ ہماری دنیا کے جو پرابلم انسان ہیں وہ یہاں آتے ہی نہیں۔ پھر امن کی باتوں کا کوئی عملی نتیجہ نکلے تو کیوں کر نکلے۔ اسی احساس کے تحت پچھلے چند سال سے میں ”پرابلم انسانوں“ کے اپنے اجتماعات میں جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور ان کی اپنی بھیڑ میں جا کر انھیں امن کا پیغام دے رہا ہوں۔ مگر جو لوگ اس راز کو نہیں سمجھتے وہ مجھ پر عجیب عجیب الزامات عائد کرتے ہیں۔

یہاں ایک نوجوان نے مجھ سے نصیحت لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے اس کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھ دئے ـــــــ حقیقت پسند بنو اور کامیابی تمہارے لئے یقینی ہو جائے گی؛

۱۹۹۵ میں یروشلم میں ایک انٹر ریلیجس کانفرنس تھی۔ اس میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر میں نے اس میں شرکت کی۔ اور وہ مقالہ پیش کیا جو الفصل بین القضیتین کے عنوان سے الرسالہ نومبر ۱۹۹۵ میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کانفرنس میں کئی عربوں کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا تھا مگر وہ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یروشلم (قدس) جانا یروشلم کے اوپر یہودیوں کے ناجائز قبضہ کو تسلیم کرنے کے ہم معنی ہے۔ ان میں سے کچھ عرب فلارنس کی کانفرنس میں موجود تھے۔

ایک مجلس میں ایک عرب شیخ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ قدس کی کانفرنس میں گئے تھے میں نے کہا کہ کیوں نہ جاتا (لم لا) پھر اس موضوع پر ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے آپ کو ایک موقع دیا تھا کہ آپ وہاں جائیں اور اس مقام پر اللہ کے لئے سجدہ کریں۔ جہاں رسول اللہ نے اور تمام دوسرے نبیوں نے سجدہ کیا۔ مگر آپ نے اس سے انکار کیا کہ آپ کا شمار ان مقدس ساجدین میں کیا جائے۔ آپ لوگوں نے ایک سنہرا موقع کھو دیا:

ن اللــه سبحانه وتعالیٰ هیأ لکم الفرصة لکی تسجدوا حیث سجد الانبیاء کلهم .لکنکم رفضتم ان تکونوا مع هٰؤلاء الساجدین المقدسین۔ انکم واللّٰه فقدتم ـرصة ذهبیة۔

جسٹس کھنہ اردو زبان جانتے ہیں اور اقبال کے اشعار بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ـھتے ہیں۔ ایک بار کھانے کی میز پر انھوں نے اقبال کا ایک اردو شعر سنایا۔ پاس ہی ایسٹر ڈم سے آئے ہوئے سوامی چیت بھاشا نند بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مکمل طور پر گیروے لباس میں ملبوس ھے۔ دور تک بھی مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ وہ اردو جانتے ہوں گے۔ مگر جیسے ہی جسٹس کھنہ نے شعر سنایا، وامی جی نے جیب سے قلم کاغذ نکالا اور جسٹس کھنہ سے دوبارہ پوچھ کر اس کو اردو رسم الخط میں لکھنے لگے۔

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں پیدا ہونے والے ہندو عام طور پر اردو زبان جانتے ے۔ بلکہ بہت سے فارسی سے بھی واقف تھے۔ جسٹس کھنہ نے بتایا کہ شہنشاہ ایران جب دہلی آئے اس وقت کے راشٹر پتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ان کے استقبالیہ جلسہ میں فارسی زبان میں

تقریر کی جس سے شاہ بہت خوش ہوئے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ جس زمانہ میں ہمارے ملک کے ہندو مسلم کلچر سے اتنا زیادہ قریب تھے، اسی زمانہ میں کچھ نام نہاد مسلم رہنماؤں کو مسئلہ ملت کے حل کی یہ الٹی تدبیر سوجھی کہ ہندوؤں سے کٹ کر اپنا علیحدہ ملک بنائیں اور ہندوؤں کو ہمیشہ کے لئے اسلام اور مسلمانوں سے دور کر دیں۔

سوڈان کے مسلمان اپنے سر پر سفید عمامہ باندھتے ہیں۔ مجھے یہ عمامہ پسند آیا۔ ان کا عمامہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ میں نے چھوٹا عمامہ استعمال کرنا شروع کیا۔ کانفرنس میں سوڈان کے شیخ اسحاق سکوتہ بھی شریک تھے۔ ان کو یہ انداز پسند آیا۔ اور انھوں نے اپنی طرف سے ایک سفید عمامہ مجھے بطور ہدیہ پیش کیا۔ اس کو لیتے ہوئے میں نے کہا : هذه جيدة مباركة وسوف تكون لي شرفاً وكرامة

سوڈان کے لوگ سیاہ فام ہوتے ہیں۔ مگر ان کا قومی لباس سفید پگڑی ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب عرب اس علاقے میں داخل ہوئے تو اس کو انھوں نے بلاد السودان (سیاہ فام لوگوں کا ملک) کہا۔ اسی سے اس ملک کا نام سودان یا سوڈان پڑ گیا۔ سوڈان بر اعظم افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ تاہم جنوبی سوڈان میں عیسائی کافی تعداد میں آباد ہیں۔

سوڈان میں اسلام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے کا سبب یہ تھا کہ کئی غیر مسلم راجاؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ مثلاً کنبورو اور زرا کاسی وغیرہ۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے افریقہ میں اسلام کی اشاعت کے تحت لکھا ہے کہ اس زمانہ کی تبلیغی سرگرمیوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلم آبادی میں اضافہ ہوتا، اگر وہ مہلک قسم کی باہمی لڑائیاں نہ ہوتیں جن میں ایک مسلم حکومت دوسری مسلم حکومت کی تباہی کا سبب بن گئی:

the propagandist activities... would have contributed to the more rapid growth of a Muhammadan population, had it not been for the internecine wars that caused one Muhammadan state to work the destruction of another. (*The Preaching of Islam*, p. 324)

یہاں کئی بدھسٹ آئے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ بدھسٹ سے بات ہوئی۔ گفت گو کے دوران انھوں نے کہا کہ سچائی کی دریافت کا آخری درجہ سکون ہے۔ جب آدمی سچائی کو دریافت کرتا ہے تو اس کو کامل ذہنی سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی سکون وہ چیز ہے جس کو دوسرے مذاہب میں جنت کہا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ ذہنی سکون کا تعلق دریافت حقیقت سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ آدمی نے کیا دریافت کیا ہے۔ مثلاً ایک ایسا نظریہ جس میں حساب وکتاب (accountability) کا کوئی تصور نہ ہو۔ جس میں موت کو خاتمہ کے ہم معنی سمجھا گیا ہو۔ ایسے نظریہ کی دریافت آدمی کے اندر ذہنی سکون لا سکتی ہے۔ مگر ایسا مذہب جس میں یہ مانا گیا ہو کہ مرنے کے بعد انسان کے قول وعمل کا حساب لیا جائے گا، وہ کبھی وہ چیز نہیں دے سکتا جس کو آپ ذہنی سکون کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ حساب کا تصور اس کو مستقل طور پر اس احساس کے تحت بے چین رکھے گا کہ معلوم نہیں آخرت کی جانچ میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

میں نے کہا کہ کسی نظریہ کو آپ اس بنا پر برحق نہیں کہہ سکتے کہ وہ آدمی کو ذہنی سکون دے رہا ہے۔ صداقت کو جانچنے کا یہ معیار درست نہیں۔ اس کے بجائے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ نظریہ بجائے خود معقول ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ تمام متعلق حقائق یہ بتاتے ہیں کہ موت پر خاتمہ کا نظریہ درست نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ زندگی ایک دور مسلسل کا نام ہے۔ یعنی جینا پھر مرنا، پھر جینا پھر مرنا۔ یہ صرف ایک مفروضہ ہے نہ کہ کوئی ثابت شدہ حقیقت۔

اس کے برعکس موت کے بعد سزا وجزا کا نظریہ انتہائی معقول ہے۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں بنتی کہ یہ مانا جائے کہ آخر کار ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب کہ ظالم کو سزا ملے اور حق پرست کو انعام دیا جائے۔

ایک اطالوی نوجوان سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے مثبت سوچ کے بارہ میں کچھ باتیں بتائیں۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ پھر میں نے کہا کہ اپنی زندگی کے بارہ میں میرا اصول مختصر طور پر یہ ہے ــــــ سادہ زندگی، اونچی سوچ (simple living, high thinking) پھر میں نے کہا

کہ اس کو آپ اٹالین زبان میں لکھئے۔ انھوں نے ایک کاغذ پر حسب ذیل الفاظ لکھے:

Vivere sempli cemente, pensare alla grande

ایک اطالوی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس نے کہا کہ میں عربی کی طالب علم ہوں۔ اور پھر اس نے عربی میں بولنا شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ روم کی یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس شعبہ میں سو سے زیادہ طالب علم ہیں۔ تاھم زیادہ تعداد لڑکیوں کی ہے، یعنی ستر فیصد۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ عربی زبان کیوں پڑھ رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہمارا ملک عرب دنیا سے بہت قریب ہے۔ ہمارے اور عرب دنیا کے بیچ میں صرف بحر متوسط حائل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم عربوں کی زبان اور ان کے کلچر کو جانیں۔

میں نے سوچا کہ دنیوی مقاصد کے لئے لوگ دوسروں کی زبان اور ان کے کلچر کے بارہ میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ مگر یہی چیز دعوتی مقصد کے لئے مسلمانوں میں پیدا نہ ہوسکی۔

کیرالا کے ایک عیسائی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام فادر نیتیا (Fr. Nithya) بتایا۔ وہ روم میں رہتے ہیں اور ایک مسیحی عالمی ادارہ میں سکریٹری ہیں۔ وہ نہایت باصلاحیت معلوم ہو رہے تھے۔ مسیحی افراد نے بے شمار اعلیٰ قسم کے ادارے کھول رکھے ہیں۔ مسیحیت سے تعلق رکھنے والوں کو وہ ان اداروں میں باعزت جگہیں دیتے ہیں۔ اس طرح وہ باصلاحیت نوجوانوں کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں اس قسم کے ادارے نہیں۔ اس لئے اپنی قوم کے باصلاحیت نوجوانوں کو ہم اسلامی خدمت کے کام میں مصروف بھی نہ کر سکے۔

ایک صاحب سے امن کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ امن کے حصول کے لئے واحد قابل عمل فارمولا صرف ایک ہے، وہ یہ کہ صورت موجودہ کو مان لیا جائے:

The only workable formula for peace is to accept the status quo.

انھوں نے کہا کہ پھر تو آپ ظلم کو ابدی لائسنس دے رہے ہیں۔ کیوں کہ صورت موجودہ کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ ظلم کو اسی حالت میں باقی رہنے دیا جائے جیسا کہ وہ ہے۔

میں نے کہا کہ ظلم کو ختم کرنے کے لئے جہاں جہاں اقدام کیا گیا ہے کیا وہاں ظلم ختم ہوگیا۔ مثلاً روس میں ظلم کو ختم کرنے کے نام پر خونیں انقلاب لایا گیا۔ مگر اس نے روس میں ظلم کا خاتمہ نہیں کیا۔ مصر میں ظلم کو ختم کرنے کے لئے شاہ فاروق کو اور پاکستان میں ظلم کو ختم کرنے کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کو ختم کیا گیا۔ مگر دوبارہ ان کے خاتمہ سے ظلم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ یہی تاریخ میں بار بار ہوا ہے۔

اصل یہ ہے کہ خاتمہ ظلم کے نام پر ٹکراؤ کرنے سے امن نہیں آتا۔ بلکہ اس چیز کو ٹالریٹ کرنے سے امن قائم ہوتا ہے جس کو آپ ظلم کا نام دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایسا نظام قائم ہو جائے جو تمام لوگوں کو بالکل ٹھیک دکھائی دینے لگے۔ آپ کوئی بھی نظام بنائیں، کچھ ایسے لوگ ہمیشہ باقی رہیں گے جن کو وہ غیر منصفانہ دکھائی دے گا۔

ظلم ختم کرنے کی واحد قابل عمل صورت یہ ہے کہ اس سے براہ راست ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ان دائروں میں کام کیا جائے جہاں ٹکراؤ کئے بغیر کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال جدید جاپان میں ملتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان عظیم ظلم کا شکار ہوا۔ امریکی غلبہ کی صورت میں جنگ کے بعد بھی یہ ظلم بدستور باقی رہا۔ مگر جاپان نے "ظالم" سے ٹکراؤ کا راستہ چھوڑ کر پر امن دائرہ میں اپنا عمل شروع کر دیا۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ الجیریا پر لکھئے۔ وہاں بہت ظلم ہو رہا ہے۔ اب تک ساٹھ ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں اور دکھ کی بات یہ ہے کہ مرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ اور مارنے والے بھی مسلمان۔ میں نے کہا کہ الجیریا (اور اس قسم کے دوسرے ملکوں میں) صرف ایک ہی فارمولا قابل عمل ہے۔ اور وہ وہی ہے جو آج بھی سعودی عرب اور دوسرے پٹرول کے ملکوں میں بالفعل پوری طرح رائج ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ "پولٹیکل اقتدار کو چیلنج نہ کرو، اس کے بعد تم کو ہر قسم کی آزادی حاصل رہے گی۔"

انھوں نے کہا کہ الجیریا میں وہاں کی حکومت جو کچھ کر رہی، کیا اس کو آپ حقوق انسانی کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے۔ میں نے کہا کہ الجیریا سے لیکر کشمیر تک ہر جگہ کے بارہ میں میری رائے یہ ہے کہ وہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقل انسانی کی خلاف ورزی کا مسئلہ

ہے۔ ان مقامات نام نہاد اسلام پسند جو کچھ کر رہے وہ سراسر بے عقلی ہے، اور بے عقلی کا انجام ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے۔

ایک عیسائی پروفیسر نے کہا کہ ہمارا انظام آپ کے اسلام سے زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ ہمارا انظام فریڈم کے اصول پر قائم ہے۔ ہم ہر ایک کو فکر و عمل کی آزادی دیتے ہیں۔ جب کہ اسلام جبر کے اصول پر قائم ہے۔ دیکھئے، ہم ہر جگہ پیس کانفرنس کرتے ہیں، اور مسلمان ہر جگہ گن کلچر چلا رہے ہیں۔

You see, we are holding peace conferences, while Muslims are engaged in gun culture everywhere.

میں نے ان صاحب کو ایک وقتی جواب دیا۔ اس کے بعد جب میں اپنے کمرہ میں آیا اور اس پر سوچنا شروع کیا تو میرے دل نے کہا کہ جہاں تک اصول اسلام کا تعلق ہے، ان کا اعتراض بلاشبہہ غلط ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان عملاً اسلام کے نام پر جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو بظاہر ایسا ہی ہے، یہ لوگ غیر مسلموں کو یہ موقع دے رہے ہیں کہ وہ اسلام پر مذکورہ قسم کے شبہات وارد کریں۔

پھر مجھے قرآن کی آیت یاد آئی جس میں اہل اسلام کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ: ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين (یونس ۸۵) اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ: اے ہمارے رب، ان کو ہمارے اوپر غلبہ نہ دے کہ وہ فخر و ناز میں مبتلا ہو جائیں اور یہ گمان کرنے لگیں کہ وہ ہم سے بہتر ہیں۔ فتنہ یہاں منکرین کا اپنے انکار کے اوپر فخر کرنا ہے۔ (یقول: لا تظهرهم علينا فيعجبوا ويظنوا أنهم خير منا، فالفتنة هٰهنا إعجاب الكفار بكفرهم) لسان العرب ۱۳/ ۳۱۷

یہ آیت براہ راست طور پر موجودہ زمانہ کے ان مسلمانوں پر صادق آتی ہے جو اپنے آپ کو انقلابی اسلام کا نمائندہ بتاتے ہیں۔ ان کے نام نہاد انقلابی اقدامات نے اسلام کو بدنام کرنے کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

انڈیا کے کئی لوگ اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کھانے کی میز پر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک سوامی جی نے گوشت، مچھلی، انڈا ہر چیز لینے سے انکار کر دیا۔ اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے

ان کی بحث شروع ہوگئی۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ سوامی جی، آپ گوشت، مچھلی، انڈا کیوں نہیں کھاتے، سوامی جی نے کہا کہ ہم جان مارنے کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ غذائیں جان مار کر حاصل کی جاتی ہیں۔ انھوں نے ایک بھارتی ودوان کا مشہور مقولہ دہرایا کہ احساس کو مارنا گناہ ہے اور احساس کو زندگی دینا نیکی ہے:

Killing of a sensation is sin and vice versa.

میز پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ سوامی جی، سائنٹفک دور میں تو اب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں زندگی ہے۔ دودھ، سبزی، پانی، حتی کہ ہوا میں بھی زندگی ہے۔ آپ کے لئے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس دنیا میں رہنا ممکن ہی نہیں۔ اگر آپ اس اصول کے مطابق رہیں تو آپ کسی دوسری جان کو تو قتل نہیں کریں گے۔ البتہ خود اپنے آپ کو قتل کرلیں گے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آپ خودکشی کو ترجیح دیتے ہیں یا، آپ کے الفاظ میں، قتل احساس کو۔ سوامی جی مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

کھانے سے فراغت کے بعد سوامی اگنی ویش سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کا کھانا آپ کو کیسا لگا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ٹھیک سے کھا نہ سکا۔ میں نے کہا کہ آپ تو اکثر باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں۔ پھر آپ دوسرے ملکوں کے کھانے کے عادی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ہر جگہ اپنے کسی ہندستانی کے یہاں ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ مجھے ہندستانی بھوجن کھلا دیتا ہے۔ مگر یہاں فلارنس میں ایسا کوئی ہندستانی نہیں ملا۔

ہمارے علماء کا حال بھی یہی ہے۔ وہ باہر جاتے ہیں تو اپنے حلقہ کے کسی مسلمان کے یہاں ٹھہرنا پسند کرتے ہیں۔ وہاں ان کو اپنی پسند کا کھانا اور اپنی پسند کا ماحول مل جاتا ہے۔ مگر اس ذوق کی بنا پر ان کے بیرونی اسفار بڑی حد تک بے فائدہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری قوموں سے ان کا اختلاط نہیں ہوتا۔ ان کے نرم اور گرم سے وہ آشنا نہیں ہوتے۔ ان کی تلخیوں کو وہ نہیں چکھتے، چنانچہ بیرونی ملکوں میں جانے کے باوجود عملاً وہ وہاں کے حقیقی حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ اپنے سے مختلف ذوق اور مختلف سوچ کے لوگوں سے اختلاط (انٹرایکشن) بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کبھی ذہنی ارتقا نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے ساتھ اختلاط کرتا ہے اور ان کی اذیتوں کو سہتا ہے وہ اس شخص سے بہتر ہے جو لوگوں کے ساتھ اختلاط نہیں کرتا اور لوگوں کی اذیتوں کو برداشت نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں پر یہی حدیث صادق آتی ہے۔

یہاں بہت سے ملکوں کے لوگ آئے ہیں۔ مسلم بھی اور غیر مسلم بھی۔ اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ جاپان سے بھی کئی لوگ آئے ہیں۔ جاپانی وفد کے قائد کا نام یہ ہے:

Most Ven. Kojun Handa
Chief Priest, Jourakuji Temple
Ueda-city. (Tel. 0268-38-2040, Fax 0268-38-8545)

ان سے دیر تک گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جاپان میں ۹۰ فیصد بودھ ہیں۔ دوسرے نمبر پر شنٹو مذہب کے لوگ ہیں۔ اور تیسرے نمبر پر عیسائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان ہمارے ملک میں بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سو سال پہلے تک مسلم ملکوں سے جاپان کا کوئی ربط ہی نہیں تھا۔

ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میں مسلم ہوں اور قفقاز سے آیا ہوں، وہ انگریزی یا عربی دونوں میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ اس لئے ان سے زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی۔ انھوں نے مجھ کو دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا: پاکستان؟ میں نے کہا کہ انڈیا۔ پھر انھوں نے کہا:

Kashmir, Bombay, You?

ان کا مطلب غالباً یہ تھا کہ کیا آپ کشمیر یا بمبئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ میں دہلی سے آیا ہوں۔ اس کے بعد گفت گو ختم ہوگئی۔

ایک نوجوان سے میں نے کہا کہ زندگی میں اصل اہمیت صحیح آغاز کی ہوتی ہے۔ اگر آپ صحیح آغاز کو پالیں تو یقیناً آپ صحیح انجام تک بھی پہنچ جائیں گے۔ اس نے کہا کہ مجھے کوئی مختصر نصیحت لکھ دیجئے۔ میں نے لکھا: no beginning, no end یعنی اگر آغاز نہیں تو انجام بھی نہیں۔

فلارنس کی کانفرنس کا انتظام کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو نے کیا تھا۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں میں پسماندہ طبقہ کی فلاح کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ دنیا میں امن کے قیام کے لئے مستقل کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، اس معاملہ میں وہ لوگ

پوری طرح سنجیدہ ہیں۔ امن کے مقصد کے تحت وہ دنیا کے مختلف حصوں میں بڑے پیمانہ پر امن کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ ان کے بعض ذمہ داروں سے میں نے کہا کہ آپ لوگوں کی کوششوں میں ایک کمی ہے۔ اور اس کمی کی بنا پر آپ کی کوششوں کا زیادہ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کو نو پرابلم پیپل کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے وہ جن کو میں پرابلم پیپل کہتا ہوں۔ نو پرابلم پیپل وہ سنجیدہ لوگ ہیں جو اپنے مزاج کے اعتبار سے امن پسند لوگ ہیں۔ وہ ٹکراؤ کو پسند نہیں کرتے۔ اس طرح گویا کہ وہ پہلے ہی سے ٹھیک ہیں۔ اس کے مقابلہ میں پرابلم پیپل وہ لوگ ہیں جن کے مزاج میں شدت ہے۔ جو ٹکراؤ کے طریقہ میں یقین رکھتے ہیں۔ جو موجودہ زمانہ کی بے امنی کا اصل سبب ہیں۔

میں نے کہا کہ اب تک آپ لوگوں نے زیادہ تر نو پرابلم پیپل سے ربط قائم کیا ہے۔ انھیں میں سے کچھ لوگوں کو بلا کر آپ امن کانفرنس کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ اس کا بھی ایک فائدہ ہے۔ مگر آپ کو اپنی کوششوں کے دائرہ کو پرابلم پیپل تک بھی پھیلانا ہوگا۔ جب تک آپ پرابلم پیپل کو اعتدال پر نہ لائیں امن کی فضا دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی۔

میں نے مزید کہا کہ اس کا ایک عملی تجربہ میں خود انڈیا میں کر چکا ہوں۔ پچھلے پچاس سال سے انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑے ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے سخت شکایات تھیں۔ اس معاملہ میں مسلم رہنماؤں نے قیام امن کی جو کوششیں کیں وہ سب نو پرابلم ہندو کی سطح پر چلتی رہیں۔ مگر ۵۰ سالہ کوشش کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

۱۹۹۲ میں ہندوؤں کا تشدد مسلمانوں کے خلاف انتہا پر پہنچ گیا جب کہ انھوں نے تاریخی بابری مسجد کو ڈھا کر وہاں ایک مندر بنا دیا۔ اس وقت سے میں نے نئی پالیسی اختیار کی۔ اب میں نے پرابلم ہندوؤں کو اپنا مخاطب بنایا۔ ان لوگوں سے تعلقات بڑھائے۔ ان کے اپنے جلسوں میں جا کر ان کو امن اور انسانیت کا پیغام دینا شروع کیا۔

پالیسی کی یہ تبدیلی انتہائی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ چند سال کی کوششوں کے نتیجہ میں فضا بدل گئی۔ چنانچہ آج انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن قائم ہو چکا ہے۔ پرابلم

ہندوں نے تخریب کا طریقہ چھوڑ کر بھائی چارہ کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ دونوں فرقوں میں لمبی مدت سے جاری غیر معتدل فضا ختم ہو گئی ہے اور دونوں کے درمیان امن کی حالت قائم ہو گئی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑے تقریباً معدوم ہو گئے ہیں۔ اس معاملہ میں یہی واحد طریقہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام کو کانفرنس کا افتتاحی اجلاس فلارنس کے قدیم شاہی محل میں کیا گیا تھا۔ صدیوں پرانا محل نہایت وسیع اور شاندار ہے۔ اس کا غیر معمولی طور پر بڑا ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔

جب میں قیام گاہ سے روانہ ہو کر یہاں پہنچا تو محل کے باہر انسانوں کا ہجوم تھا۔ خصوصی مہمانوں کو دیکھ کر وہ لوگ تالیاں بجا کر ان کا استقبال کرتے تھے۔ میں قریب پہنچا تو راستہ کے دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگوں نے پر جوش طور پر تالیاں بجانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو ابل پڑے۔ مجھے آخرت کا لمحہ یاد آ گیا جب کہ میں مر کر وہاں پہنچوں گا۔ میرے دل نے کہا: کیا آخرت میں بھی کوئی میرے لئے تالیاں بجائے گا۔ کیا وہاں بھی کوئی ہو گا جو میری آمد پر خوشی کا اظہار کرے۔ دنیا کی تالیاں کتنی زیادہ بے قیمت ہیں اگر آخرت میں کوئی تالیاں بجانے والا نہ ہو۔

افتتاحی اجلاس میں فلپائن کی خاتون صدر اکینو (Corazon C. Aquino) مہمان خصوصی کے طور پر شریک تھیں۔ میری سیٹ اسٹیج کے عین قریب اگلی صف میں تھی۔ اجتماع کی کارروائی کے دوران میرے دل میں خیال آیا کہ اگر اس وقت میں ایسا کروں کہ کود کر اسٹیج پر پہنچوں اور صدر اکینو سے کہوں کہ اسلام قبول کرو ورنہ تم جہنم میں جاؤ گی:

Accept Islam, otherwise you will go to hell.

تو کیا یہ دعوت کا عمل ہو گا۔ میرے دل نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مجنونانہ عمل ہو گا نہ کہ دعوت اور تبلیغ کا عمل۔ دعوت یہ نہیں ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح چیخ کر اپنی آواز دوسروں کے کانوں میں داخل کر دیں۔ دعوت کا معیار، قرآن کے الفاظ میں، یہ ہے کہ وہ قولاً بلیغاً فی انفسہم (النساء ۶۳) ہو نہ کہ کسی کو لفظی پتھر مارنا۔

۲۲ اکتوبر کی شام کو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں دوسرے ممتاز افراد کے علاوہ خصوصی مہمان کی حیثیت سے فلپائن کی خاتون صدر اکینو اور کئی اہم شخصیتیں اسٹیج پر موجود تھیں۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ آخری تقریر صدر اکینو کی تھی۔ انھوں نے تیار شدہ تقریر کو پڑھ کر سنایا۔ یہ انگریزی زبان میں تھی۔ ان کا انگریزی لہجہ نہایت عمدہ تھا۔ تاہم ان کی لمبی تقریر میں صرف ایک بات کی تفصیل تھی۔ فلپائن میں قدیم حکمراں مارکوس کے مظالم اور ان کے شوہر (Benigno S. Aquino) کا قتل ہونا اور اس کے بعد خود خاتون کا صدر کے عہدہ پر پہنچنا۔

تاہم اس تقریر میں ایک بات نہایت سبق کی تھی۔ اکینو کے خاندان پر مارکوس نے شدید مظالم کئے۔ حتی کہ ۱۹۸۳ میں ان کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ مگر انھوں نے کہا کہ ہم نے مسیح اور گاندھی کی تعلیم کے مطابق یہ طے کر لیا تھا کہ ہمیں تشدد کے مقابلہ میں تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرنا ہے۔ چنانچہ میرے شوہر پر ظلم ہوا تو انھوں نے ہنگر اسٹرائک کر دی۔ ان کے قتل کے بعد فلپائن کے عوام کی بڑی تعداد میری حمایت پر آگئی۔ مگر میں نے ہمیشہ پر امن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی سیاسی تحریک چلائی۔ یہاں تک کہ مارکوس کو مجبور ہو کر الکشن کرانا پڑا جس نے ۱۹۸۶ میں مجھ کو صدارت کے منصب پر پہنچا دیا۔ انھوں نے اپنے طریقہ کو یہ نام دیا برائی کا مقابلہ امن کے طریقوں سے:

resistance of evil by the ways of peace

عجیب بات ہے کہ جس فلپائن میں سنگین مظالم کے باوجود اکینو نے اپنی سیاسی تحریک مکمل طور پر پر امن انداز میں چلائی۔ اسی فلپائن میں مسلم لیڈر تعداد کی قلت کے باوجود مظالم کا نام لے کر ۳۰ سال سے متشددانہ انداز میں اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ کامیاب تو نہیں ہوئے۔ البتہ فلپائن کے مسلمانوں کی مشکلات میں انھوں نے سو گنا زیادہ اضافہ کر دیا۔

فلپائن ایک مجمع الجزائر ہے۔ اس میں سات ہزار سے زیادہ چھوٹے بڑے جزیرے شامل ہیں۔ اس کی آبادی تقریباً ۵ کروڑ ہے۔ اس میں پچاسی فیصد عیسائی ہیں۔ مسلمان مجموعی آبادی میں تقریبا پانچ فیصد ہیں۔ تاہم اس کے ایک حصہ میں مسلمان زیادہ بڑی تعداد

میں آباد ہیں۔ ان کو موروز کہا جاتا ہے۔ یہ نام ان کو اسپینیوں نے دیا تھا۔

فلپائن کا جنوبی حصہ ملایا کے قریب ہے۔ چنانچہ اس حصہ میں ملایا کے علاقہ سے مسلمان جانا شروع ہوئے۔ ان کے اثر سے جنوبی حصہ کے کئی جزائر میں اسلام پھیل گیا۔ مثلاً سولو (Sulu) منڈاناو (Mindanao) پالاوان (Palawan) وغیرہ۔ اس دوران ایک طاقت ور سردار (datu) مسلمان ہوگیا۔ حتیٰ کہ اس علاقہ میں مسلم راجہ کی سلطنت قائم ہوگئی۔

مگر سولھویں صدی کے وسط میں اسپینی آگئے۔ یہاں ان کا غلبہ قائم ہوگیا۔ اسپینی غلبہ کے بعد اسلام کی اشاعت کا عمل رک گیا۔ ایک مورخ نے لکھا ہے کہ اسپینی اگر ایک صدی کے بعد آتے، یا اگر ان کا محرک صرف اقتصادی ہوتا تو آج پورے فلپائن میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی:

> Had they come a century later or had their motives been strictly commercial, Filipinos today might be a predominantly Muslim people. (14/241)

فلپائن کے جنوبی علاقہ کے بارہ میں مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں ان کی اکثریت ہے۔ جب کہ حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ان کی تعداد نصف سے کچھ کم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس علاقہ میں علیحدہ مسلم حکومت قائم کرنے کی تحریک اٹھی۔ یہ صدر مارکوز کا زمانہ تھا جن کی صدارت ۱۹۶۶ سے ۱۹۸۶ تک رہی ہے۔ مارکوز کا کہنا تھا کہ مسلمان اگر پولٹیکل انڈپنڈنس کا مطالبہ نہ کریں تو ہم ان کو تمام دوسری آزادیاں دینے کے لئے تیار ہیں۔ مگر مسلم لیڈر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں حکومت نے ان پر سخت ترین مظالم کئے۔ آخر کار اب مسلمان مجبور ہو کر خاموش ہو رہے ہیں۔

افتتاحی اجلاس میں شیخ مصطفیٰ بن احمد العلوی (رئیس جمعیۃ علماء المغرب والسنغال) نے بھی تقریر کی۔ انھوں نے عربی میں لکھی ہوئی ایک تقریر پڑھی۔ اس میں اسلام کو امن و سلامتی کے مذہب کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔

ایران کے ایک صاحب سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ وہ تہران یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ نہایت عمدہ انگریزی بول رہے تھے۔

۲۳ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر ہم لوگ ساتھ تھے۔ یں نے پوچھا کہ کچھ اسکالرس نے لکھا ہے کہ اسلامی فلسفہ نام کی کوئی چیز موجود نہیں :

There is no Islamic philosophy, in the true sense of the word.

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اسلامی فلسفہ کی اساس مقدس متن (ٹکسٹ) پر ہے۔ یہ فلسفہ کے بنیادی تصور کی نفی ہے۔ کیوں کہ فلسفہ اپنے صحیح مفہوم کے اعتبار سے وہ ہے جو عقل انسانی پر مبنی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اسلامی فلسفہ تو نہیں ہے، البتہ مسلم فلسفہ ضرور ہے۔ یں نے کہا کہ وہ لوگ دوبارہ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں یں جو فلسفی پیدا ہوئے، وہ اپنے اسلامی عقیدہ سے آزاد نہ تھے۔ ان کا فلسفہ بھی بنیادی طور پر اسلامی عقیدہ ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کو مانتے ہوئے کہا کہ ہاں، انھوں نے فلسفہ کو اسلامائز کیا۔

پھر یں نے کہا کہ مگر خود مغرب کے فلاسفہ کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ بھی کہیں نہ کہیں جا کر اپنے مسیحی عقیدہ سے متاثر نظر آنے لگتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات بھی درست ہے۔ انھوں نے ہیگل کی مثال دی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا فلسفہ مسیحی عقیدہ کا فلسفیانہ اظہار تھا۔

ناشتہ کے آخر یں یں نے چند جملے فارسی یں کہے۔ یں نے کہا : شما فارغ شدیم۔ انھوں نے کہا : از چہ۔ یں نے کہا از چائے۔ انھوں نے کہا بلے۔ اور پھر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں یں چلے گئے۔

۲۳ اکتوبر کو پانچ مختلف ہالوں یں پانچ الگ الگ پروگرام تھے۔ یں نے اس ہال کا انتخاب کیا جس یں افریقہ کا موضوع رکھا گیا تھا۔ اس کے چھ مقررین یں سے ایک احمد بن بیلا بھی تھے۔ جو الجیریا کے سابق پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں۔

اس پروگرام کو سننے کے لئے اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مقررین اطالوی یا فرانسیسی زبان یں تقریر کریں گے۔ وہاں اتفاق سے عربی یا انگریزی یں ترجمہ کا انتظام نہ تھا۔ میرے گائڈ ایک خاتون کو لائے جو اطالوی زبان جانتی تھیں۔ وہ میرے قریب کی کرسی پر بیٹھ کر مجھے تقریر کا مفہوم بتاتی رہیں۔ اس کے بعد جب فرانسیسی تقریر شروع ہوئی تو ان کے لئے بھی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ وہ

فرانسیسی نہیں جانتی تھیں۔ انھوں نے فوراً یہ کیا کہ معاون آلہ اپنے کان میں لگالیا۔ اب وہ خود مقرر کی تقریر کا اطالوی ترجمہ سن رہی تھیں اور میرے لئے اس کا انگریزی ترجمہ کرتی جاتی تھیں۔

میں نے سوچا کہ انسان کا ذہن بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ ہر مسئلہ کا فوری حل دریافت کرلیتا ہے۔ فطرت کے اس قیمتی عطیہ سے صرف وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو مسئلہ پیش آنے کے بعد تدبیر تلاش نہ کریں بلکہ فریاد و ماتم میں لگ جائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں محرومی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔

کانفرنس کے تمام اجلاس کی ویڈیو ریکارڈنگ ہو رہی تھی اور عین اسی وقت وہ ہال میں رکھے ہوئے وی سی آر پر لوگوں کو دکھائی بھی جا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ لمحہ لمحہ کی یہ تصویرکشی اور ریکارڈنگ اس حقیقت کا ایک علامتی اعلان ہے کہ اسی طرح خدا کے برتر انتظام کے تحت ہر انسان کی لمحہ بہ لمحہ ریکارڈنگ ہو رہی ہے۔ یہ پورا ریکارڈ خدا کے خزانہ میں محفوظ ہے۔ آخرت میں وہ ہر شخص کے اعمال نامے کی صورت میں ہر ایک کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

افریقی مقررین کی تقریریں سننے کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہر مقرر نے صرف افریقہ کے مسائل بیان کئے۔ اور بیرونی طاقتوں کی شکایت کی کہ وہ ان مسائل کے حل میں ان کی مدد نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی تقریر کوئی تقریر نہیں ہے۔ یہ صرف وقت کا ضیاع ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم خود اپنے آپ میں مشغول ہے۔ کسی کو یہ فرصت نہیں کہ وہ آپ کے لئے دوڑے یا آپ کے مسائل حل کرے۔

پھر میں نے کہا کہ اس قسم کی تمام تقریریں غیر فطری ہیں۔ کیوں کہ اس دنیا میں پرابلم کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ پرابلم کے ساتھ ہمیشہ مواقع بھی موجود ہوتے ہیں۔ اب حل یہ ہے کہ پرابلم کو نظرانداز کرکے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ لوگ صرف دو چیز جانتے ہیں۔ پرابلم اور سولیوشن۔ حالاں کہ یہاں ایک تیسری چیز بھی ہے۔ اور وہ مواقع (opportunities) ہیں۔ لوگ اپنے ثنائی طرز فکر کی وجہ سے ہمیشہ پرابلم اور سولیوشن میں الجھے ہوتے ہیں۔ اگر وہ جانیں کہ یہاں ایک تیسری چیز (مواقع) بھی موجود ہیں۔ تو وہ فوراً مواقع کو استعمال کرکے اپنے مسائل کو حل کرلیں۔

میں نے کہا کہ مشہور مقولہ ہے کہ When there is a will there is a way اسی طرح

میں کہتا ہوں کہ جہاں مسائل ہوں گے وہیں مواقع بھی ضرور موجود ہوں گے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی استثناء نہیں۔

اٹلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے میں نے کہا کہ کریٹیو زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کسی ایک ذہنی حالت پر نہ ٹھہریں۔ بلکہ اپنا ذہنی سفر برابر جاری رکھیں۔ ذہنی سفر برابر جاری رہنے کی پہچان یہ ہے کہ آپ ہر روز کوئی نئی چیز دریافت کر رہے ہوں۔ میں نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو چاہئے کہ ایک متلاشی کی زندگی گزاریں:

Live the life of a seeker.

پھر میں نے ان سے کہا کہ میری بات دہرائیے کہ میں نے کیا کہا۔ انھوں نے انگریزی میں اسے دہرایا۔ آخر میں میں نے کہا کہ میرے اس جملہ کا اٹالین زبان میں ترجمہ کیجئے۔ انھوں نے حسب ذیل ترجمہ لکھ کر دیا:

Vivi La Vita Del Cercatore

ایک مسیحی عالم نے صلیب کے فلسفہ پر لمبی گفتگو کی۔ انھوں نے صلیب کو سب کچھ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ صلیب امن و سلامتی کا راستہ ہے:

Cross is the Way of peace.

میں نے کہا کہ صلیب کا امن سے کیا تعلق ہے، اس کو مثال سے واضح کیجئے۔ مگر وہ کوئی واضح مثال نہ دے سکے۔ اکثر لوگ بیانیہ انداز میں یا مدعیانہ اسلوب میں ایک بات کہتے ہیں۔ مگر جب مثال مانگی جائے تو مثال نہیں دے پاتے۔ آدمی جب بھی کوئی دعویٰ کرے تو اس کو جاننا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اس کی تصدیق میں ایک حقیقی مثال (نہ کہ فرضی مثال) پیش کرے۔ مثال کے بغیر دعویٰ بے دلیل رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ ایک شاعرانہ مضمون بندی ہے نہ کہ کوئی واقعی بات۔

کچھ عربوں سے بات ہوئی۔ میں نے کہا کہ آجکل اسلام کی دھوم بہت زیادہ ہے۔ مگر اسلام کی اسپرٹ غائب ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ اسپرٹ سے آپ کی کیا مراد ہے۔ میں نے کہا کہ مثلاً حدیث میں ہے کہ اکثروا ذکر ھادم اللذات۔ اس حدیث کے مطابق

ایمان و اسلام کی زندگی کا تقاضا ہے کہ آدمی بہت زیادہ موت کو یاد کرنے والا بن جائے۔ مگر آجکل میں دیکھتا ہوں کہ ہر جگہ بس زندگی کا چرچا ہے۔ موت کا تذکرہ کہیں نہیں۔

انھوں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کہہ کہتے ہیں۔ ہم سب لوگ موت کو یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ موت کو یاد کرنے کی پہچان کیا ہے۔ وہ خود اس حدیث کے الفاظ میں موجود ہے۔ اس میں موت کو ھادم اللذات (لذتوں کو ڈھا دینے والی) کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کو یاد کرنے والا وہ ہے جس کے لئے موت کی یاد ہادم اللذات بن جائے۔ اس کے لئے دنیا کی چیزوں میں لذت نہ رہے۔ وہ دنیا کی لذتوں سے محظوظ نہ ہو سکے۔ دنیا کی ہر لذت اس کے لئے بے لذت بن گئی ہو۔ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

فلارنس میں ایک مسیحی ادارہ ہے جس کے تحت مختلف تعلیمی اور رفاہی شعبے قائم ہیں۔ اس کے ڈائرکٹر فادر چیارونی (Chiaroni) ہیں۔ ادارہ کا پورا نام یہ ہے:

Parrocclic Madonna Della Tosse

اس ادارہ کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں ان کے اجتماع میں اسلام کا تعارف پیش کروں۔ اس کے مطابق ۲۳ اکتوبر کی شام کو نماز مغرب کے بعد ہم لوگ وہاں کے لئے روانہ ہوئے۔ شام کا کھانا بھی انھیں کے یہاں تھا۔ ہم لوگ پہنچے تو کھانا میز پر رکھا جا چکا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ سیدھے طعام گاہ میں چلے گئے۔

یہ ایک سادہ اور نہایت صاف ستھرے انداز کا ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی پہلی چیز جس نے متوجہ کیا وہ اس کی ایک بڑی تصویر تھی جو فریم کرکے دیوار پر لگائی گئی تھی۔ یہ آئن سٹائن کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے نیچے آئن سٹائن کا ایک قول اس طرح لکھا ہوا تھا ــــــ امن کو طاقت کے ذریعہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ امن صرف مفاہمت کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے:

Peace cannot be kept by force. It can only be achieved by understanding.

چوکور میز کے گرد ادارہ کے تمام ذمہ دار بیٹھ گئے۔ یہ تقریباً ۳۰ عورت اور مرد تھے۔ کھانا اور

کمرہ کا پورا ماحول انتہائی سادگی کے ساتھ انتہائی باقاعدگی اور سلیقہ مندی کا نمونہ تھا جس کی تصویر کشی لفظوں میں نہیں کی جاسکتی۔

میز پر پانی کی بوتل کے اوپر سرخ رنگ میں لکھا ہوا تھا پنا (PANNA) میں سمجھا کہ اس کا مطلب پانی ہے۔ اور ہندستان کا پانی اٹلی میں پنا بن گیا ہے۔ مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پنا مخفف انداز میں کمپنی کا نام ہے۔ ورنہ اطالوی زبان میں پانی کو اکوا (acqua) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اکثر لوگ ایک مفروضہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں۔ اور پھر بلا تحقیق اس کے اوپر منزل در منزل عمارت بناتے چلے جاتے ہیں۔ حالاں کہ وہ سب کا سب بے بنیاد ہوتا ہے۔ جب ابتدائی مفروضہ ہی غلط ہو تو اس کی بنیاد پر گھڑی ہوئی کہانی کیوں کر درست ہو سکتی ہے۔

کھانے کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اٹلی کی آبادی میں کمی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ذاتی سہولت کی خاطر برتھ کنٹرول کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اکثر شادی شدہ جوڑے بچے کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ کھانے پر ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ تھے۔ انھوں نے تصویر دکھائی کہ انھوں نے کیرلا کے دو بچوں کو اڈاپٹ کیا ہے۔

اس کے نتیجہ میں کئی نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اٹلی کے لوگ زیادہ کمائی کے لئے باہر جایا کرتے تھے۔ اب خود اٹلی باہر کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے کہ وہ اٹلی آئیں اور یہاں کام کریں۔ خاص طور پر چھوٹے کام یا مزدوری والے کاموں میں کارکنوں کی بہت قلت ہو گئی ہے۔

کھانے کے بعد ساڑھے نو بجے ہم لوگ ادارہ کے ہال میں جمع ہوئے۔ یہاں بہت سے مرد و عورت کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری تقریر انگریزی میں تھی جس کا ترجمہ ساتھ ساتھ اطالوی زبان میں کیا جارہا تھا۔ تمہیدی کلمات میں منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آجکل اسلام کے بارہ میں غلط فہمیاں بڑھ گئی ہیں۔ خاص طور پر یورپ میں یہ غلط فہمیاں اور زیادہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہب کو براہ راست طور پر جانیں۔

اس کے بعد میں نے بتایا کہ مسلم کون ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے قرآن کی آیت

(ابراہیم ۲۴) کو پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن میں مومن کی مثال درخت سے دی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن اپنے ماننے والے کو کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اس دنیا میں درخت کی مانند رہے۔ وہ خدا کی دنیا سے رزق لے کر ارتقا کرے۔ اور پھر ہر اعتبار سے اہل عالم کے لئے نفع بخش بن جائے۔

اس کے بعد میں نے ایک پیپر پیش کیا۔ یہ صرف احادیث کے ترجمہ پر مشتمل تھا۔ اس کا عنوان تھا ــــــ اپنے ماحول میں مسلم کا سلوک:

Behaviour of a Muslim in his environment

اس میں ۶۰ حدیثیں تھیں جو سب کی سب صحاح سے لی گئی تھیں۔ ترتیب یہ تھی کہ میں ایک حدیث پڑھتا تھا اور میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک پروفیسر اس کا ترجمہ اٹالین زبان میں کرتے جاتے تھے۔

نصف حدیثیں سنانے کے بعد میں نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو ساری حدیثیں آپ کو سناؤں۔ اور اگر آپ کی رائے ہو تو حدیث سنانے کا سلسلہ یہیں روک دیا جائے اور اس کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں، آپ تمام حدیثیں پہلے سنادیں۔ اس کے بعد سوال وجواب ہوگا۔ چنانچہ میں نے تمام حدیثوں کے ترجمے سنائے۔ جن کی تعداد مجموعی طور پر ساٹھ تھی۔

اس کے بعد صدر جلسہ فادر چیارونی نے اعلان کیا کہ اب آپ لوگ مقرر سے سوالات کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کے سوالات کا جواب دیں گے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے پوچھا کہ سوال صرف پیپر کے دائرہ میں کیا جا سکتا ہے یا اس کے باہر کے سوالات بھی پوچھے جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کو اختیار ہے کہ جو سوال چاہیں کریں۔ دو تین آدمیوں نے انگریزی میں سوال کیا اور بقیہ تمام لوگوں نے اٹالین زبان میں سوالات کئے۔ میں نے ہر ایک کا جواب انگریزی میں دیا۔ جس کا فوری ترجمہ کیا جاتا رہا۔

صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ کسی نے اب تک اسلام کو ہمارے سامنے اس طرح پیش نہیں کیا تھا۔ اب تک ہم اسلام کے بارہ میں وہی چند باتیں جانتے تھے جو میڈیا کے ذریعہ ہم تک پہنچی

تھیں۔ دوسرے کئی لوگوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم نے اسلام کو از سر نو دریافت کیا ہے۔ ہماری اسلامی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔

پروگرام کے خاتمہ پر ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں اور مراکو (مغرب) سے یہاں آیا ہوں۔ انھوں نے اپنا نام اس طرح کاغذ پر لکھ دیا ـــــ صدیگی محمد (Sdaigui Mohamed) ان سے عربی میں بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ فلارنس میں تقریباً پانچ ہزار مسلمان ہیں جو بیشتر افریقہ کے ہیں۔ یہاں شہر کے اندر ایک مسجد بھی ہے۔ یہ مسلمان زیادہ تر چھوٹے کام کرتے ہیں۔ تاہم یہاں ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ایک خاتون نے پوچھا کہ اسلام میں عورت کا درجہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام عورت اور مرد کو مکمل طور پر برابری کا درجہ دیتا ہے۔ دونوں میں عزت اور حقوق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ صالح عورت کے لئے بھی اسی طرح جنت کی خوشخبری ہے جس طرح صالح مرد کے لئے۔

البتہ مقام کار (work place) دونوں کا اسلام میں الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ ایک عملی بندوبست (arrangement) ہے نہ کہ امتیاز۔ میں نے مثال دی کہ ایک بزنس ہاؤس میں کچھ لوگ آفس کے اندر کام کرتے ہیں اور کچھ لوگ فیلڈ ورک میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک گروپ اندر کا کام سنبھالتا ہے اور دوسرا گروپ باہر کا کام۔ اس فرق کو کوئی امتیاز نہیں سمجھتا۔ بلکہ صرف تقسیم کار سمجھتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں عورت اور مرد کے مقام کار میں فرق رکھا گیا ہے۔ عورت بنیادی طور پر گھر کے کام کو سنبھالتی ہے اور مرد بنیادی طور پر باہر کا کام۔ مگر یہاں بھی یہ فرق صرف تقسیم کار کے معنی میں ہے نہ کہ امتیاز کے معنی میں۔

میں نے کہا کہ عورت کے بارہ میں مغربی تصور اور اسلامی تصور میں صرف یہ فرق ہے کہ مغربی تصور میں عورت اور مرد کو دو برابر کی شخصیت مانا گیا ہے۔ اور اسلام یہ کہتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کے لئے تکملہ (complementary) ہیں۔

ایک صاحب نے اسلامی فنڈمنٹلزم کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ مروجہ مفہوم میں فنڈمنٹلزم کو فناٹسزم کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے لیا جائے تو اسلام میں فناٹسزم نہیں ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس میں انسانوں کو حد درجہ رعایت دی

گئی ہے۔ اسلام میں حکیمانہ انداز کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ کٹرپن، انتہاپسندی اور تشدد کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

ایک صاحب نے پوچھا کہ گاندھی کے نظریہ اور اسلام کے نظریہ میں کیا فرق ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک گاندھی کے مذہب کا تعلق ہے تو گاندھی ایک ہندو تھے اور ہندو مذہب الگ ہے اور اسلام الگ۔ مگر جہاں تک ان کے طریق کار کا تعلق ہے جس کو عدم تشدد (non-violent activism) کہا جاتا ہے تو وہ اسلام کے عین مطابق ہے۔ اسی لئے وقت کے تمام مسلم علماء نے اس طریق کار کو اختیار کیا اور سیاسی اعتبار سے گاندھی کو اپنا قائد بنا لیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامک ایکٹوزم بھی عین وہی ہے جس کو نان وائلنٹ ایکٹوزم کہا جاتا ہے۔

اس طرح کے مختلف سوالات کئے گئے۔ کسی نے بھی کراس کو سچن نہیں کیا۔ پوری گفتگو نہایت سنجیدہ اور افہام وتفہیم کے ماحول میں ہوئی۔

پروگرام کے خاتمہ پر میں نے ایک مسیحی نوجوان مسٹر سیرجیو (Sergio) سے پوچھا کہ اس بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔ نوجوان نے نہایت سادگی سے جواب دیا: آج آپ کو سن کر میں نے جانا کہ اب تک اسلام کے بارہ میں بہت کم جانتا تھا۔ اس پروگرام نے میرے اندر یہ خواہش جگادی کہ میں اسلام کے بارہ میں اور زیادہ معلومات حاصل کروں۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ آپ نے جس سادگی اور وضاحت کے ساتھ اسلام کے بارہ میں بتایا وہ بہت انوکھا تھا۔ آپ کی بات خوب سمجھ میں آئی۔

موجودہ زمانہ کی نئی پیدا شدہ چیزوں میں سے ایک چیز یہ ہے کہ آج لوگ صرف اپنے خول میں رہنا کافی نہیں سمجھتے۔ ہر آدمی خارجی دنیا کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے۔ اس معلوماتی خواہش کا تعلق تمام چیزوں سے ہے حتی کہ مذہب سے بھی۔ لوگ اپنے مذہب کو مانتے ہوئے دوسرے مذاہب کو جاننے کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ ایک نیا امکان ہے جس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

تاہم اس جدید امکان کو استعمال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنی بات کو جدید انسان کے پسندیدہ اسلوب میں پیش کیا جائے۔ آج کا پسندیدہ اسلوب سائنٹفک

اسلوب ہے۔ مناظرانہ یا واعظانہ انداز آج پسند نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح ادبی یا قصائدی انداز بھی آج کے اعتبار سے غیر موزوں ہے۔ اس لئے جدید امکان کو استعمال کرنا صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم مخاطب کے اپنے اسلوب کے مطابق بات کہیں۔ ہمارا تیار کیا ہوا لٹریچر جدید انسان کو اپیل کرنے والا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ سن کر بھی نہیں سنے گا۔ پڑھ کر بھی کچھ نہیں پائے گا۔

۲۴ اکتوبر کو ناشتہ کی میز پر جسٹس کھنا (سابق جج سپریم کورٹ) سے مسٹر محمد علی جناح کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ مسٹر جناح انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ وہ فوراً بولے یہ مکمل طور پر نادرست بات ہے:

It is absolutely incorrect

انھوں نے کئی بڑے ہندوؤں کے تاثرات مسٹر جناح کے بارہ میں نقل کئے۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ چنڈی گڑھ میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج تھے تو مسٹر گاڈگل (گورنر پنجاب) نے ان سے کہا کہ مسٹر جناح کی پیشہ ورانہ دیانت داری (Professional integrity) مکمل طور پر ہر شبہ سے بالاتر تھی۔ اور اسی لئے وہ اپنے وقت میں انڈیا کے نمبر ایک قانون داں بن گئے۔

میں نے مسٹر جناح کے بارہ میں کئی تعلیم یافتہ ہندوؤں سے بات کی۔ میں نے محسوس کیا کہ بٹوارہ کی تلخی کے باوجود ہر ایک ذاتی اعتبار سے مسٹر جناح کا قدرداں تھا۔ مثلاً مسٹر ملکانی (وائس پریسیڈنٹ بھارتیہ جنتا پارٹی) کی زبان سے ایک بار میں نے مسٹر جناح کی تعریف سنی۔ میں نے کہا کہ مسٹر جناح تو ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار تھے، پھر بھی آپ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ مسٹر ملکانی نے کہا: کچھ بھی ہو، وہ دَم دار تو تھا۔

فلارنس کے مختلف علاقوں میں بار بار جانے کا اتفاق ہوا۔ مگر وہاں کبھی ہارن کی آواز سنائی نہیں دی۔ حتی کہ پرشور انجن والی گاڑیاں بھی کہیں دکھائی نہیں دیں۔ آج میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی مسلسل ہارن بجاتی ہوئی سڑک پر دوڑی چلی جارہی ہے۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ ایمبولنس کی گاڑی ہے۔ مغربی ملکوں میں ذاتی مقصد کے لئے کوئی ہارن نہیں بجاتا۔ یہاں صرف دو قسم کی گاڑیاں ہارن بجاتی ہیں۔ ایمبولنس کی گاڑی یا فائر بریگیڈ کی گاڑی۔

جسٹس کھنہ روزانہ صبح کو بی بی سی کا ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ چند دن

پہلے انھوں نے بی بی سی پر سناکہ اٹلی میں اگرچہ سیاسی عدم استحکام کا مسئلہ ہے۔ اس کے باوجود اقتصادی شرح ترقی (rate of growth) کے اعتبار سے اٹلی پورے یورپ میں سب سے آگے ہے۔

ایک ہندستانی جو عرصہ سے یورپ میں رہتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ یورپ کے شہروں میں آپ نے خاص چیز کیا دیکھی۔ انھوں نے کہا کہ سکون۔ میں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یورپ کے شہروں کی سب سے زیادہ ممتاز صفت وہاں کی ریاضیاتی صحت ہے۔ جو ہر چیز اور ہر پہلو میں نظر آتی ہے:

The most striking feature of European cities is the mathematical precision which you see there in every thing and in every aspect.

فلارنس کو اور اسی طرح یورپ کے دوسرے شہروں کو دیکھ کر بار بار میرے ذہن میں یہ سوال آتا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دین باطل کے علمبرداروں میں ہر طرف سلیقہ مندی ہے۔ اور دین حق کے حاملین کے یہاں ہر طرف بدسلیقگی دکھائی دیتی ہے۔ میں برسوں سے اس پر غور کر تا رہا ہوں۔ آج ۲۴ اکتوبر کی صبح کو اس کا جواب میرے ذہن میں آیا۔ کم از کم ذاتی طور پر میں مطمئن ہو گیا کہ یہی اس سوال کا صحیح جواب ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس فرق کا تعلق دین باطل یا دین حق سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق تمام تر اس ردعمل سے ہے جو جدید سائنسی انقلاب کے مقابلہ میں دونوں نے اختیار کیا۔ جدید سائنسی انقلاب جب ظاہر ہوا تو دین باطل کے علم برداروں نے اس کو دل وجان سے قبول کر لیا۔ اس کے برعکس دین حق کے علم برداروں نے اس کو اپنا دشمن سمجھا اور اس کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ دین باطل کے علمبرداروں کے یہاں ہر چیز میں جو نظم اور سلیقہ دکھائی دیتا ہے وہ ان کے مذہب کی دین نہیں ہے بلکہ تمام تر سائنس کی دین ہے۔ اسی طرح دین حق کے علمبرداروں کے یہاں جو بدنظمی اور بدسلیقگی نظر آتی ہے وہ بھی ان کے مذہب سے نہیں آئی ہے۔ وہ صرف اس کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ سائنس کو اپنے لئے اجنبی یا خلاف اسلام سمجھ کر وہ اس سے دور ہو گئے۔

سائنس کیا ہے۔ سائنس نظم فطرت کا انکشاف ہے۔ سائنس خدا کی چھپی ہوئی نعمتوں کا ظہور ہے۔ سائنس حقائق عالم کا تعارف ہے۔ سائنس حسن تخلیق کو دریافت کرکے اس کو انسانی دنیا

میں منطبق کرنا ہے۔ سائنس سے بے تعلقی ایسی ہی تھی جیسے آفتاب کے نکلنے کے بعد کوئی شخص اپنی دونوں آنکھوں کو بند کر لے۔

۲۴ اکتوبر کو صبح کا سیشن اسلام کے بارہ میں تھا۔ اس کی صدارت اٹلی کے ایک مشہور جرنلسٹ ایگور مان (Igor Man) نے کی۔ چار مسلم مقررین تھے۔ مصطفی العلوی (مراکو) احمد محمد زبارہ (یمن) نصراللہ پورزوادی (ایران) اور راقم الحروف۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ باہر کے برآمدہ میں بھی بہت سے لوگ کھڑے ہوئے نظر آئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ اسلام کے بارہ میں سننا چاہتے ہیں۔

پہلے صدر جلسہ نے مختصر تقریر اطالوی زبان میں کی۔ اس کو میں نے انگریزی میں سنا۔ انھوں نے کہا کہ یورپی ملکوں میں اسلام کے بارہ میں ایک خوف (fear) پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام ایک تشدد کا مذہب ہے۔ اسلام ان ٹالرنس کو فروغ دیتا ہے۔ مقررین کو آج اس سوال کا جواب دینا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام اگر تشدد کا مذہب ہوتا تو وہ ساری دنیا میں پھیل نہیں سکتا تھا۔ اور اگر سیاسی طاقت کے زور پر پھیلتا تو سیاسی طاقت کے کمزور ہوتے ہی وہ ختم ہو جاتا۔

شیخ احمد محمد زبارہ نے اپنی عربی تقریر میں قرآن کی کئی آیتیں پیش کیں اور کہا کہ اسلام تمام آسمانی مذاہب کی تصدیق کرتا ہے (انّ الاسلام یُقِرُّ الادیان السماویۃ کلھا) شیخ مصطفی العلوی کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام عدل اور سلامتی کا دین ہے۔ (الاسلام دین العدل والسلام) پروفیسر پورزوادی کی انگریزی تقریر ایرانی اسلام پر تھی۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانی کی عمر میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام سارے مسائل کا حل ہے۔ اسی لئے ہم لوگ شاہ کی حکومت کے خلاف ہو گئے تا کہ اس کو ختم کر کے اپنے خوابوں کا اسلام قائم کر سکیں۔ مگر انقلاب کے بعد ایران میں نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ مثلاً یہ سوال پیدا ہو گیا کہ کیا دور جدید میں سنگسار کرنا اور ہاتھ کاٹنا جیسی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ جلسہ کے آخر میں میں نے ایرانی پروفیسر سے کہا کہ آپ نے تو صرف مسائل بیان کئے۔ حالاں کہ مقرر کی حیثیت سے آپ سے توقع کی گئی تھی کہ آپ مسائل کا حل بتائیں گے۔

میری تقریر انگریزی میں تھی اور اس کا عنوان تھا: اسلام اور امن (Islam and Peace)
حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے بتایا کہ آپ کی تقریر بہت واضح اور قابل فہم تھی۔ اس کو بہت پسند کیا گیا۔ صدر جلسہ نے آخر میں بولتے ہوئے کہا کہ انقلاب کے بعد میں ایران گیا اور امام خمینی سے انٹرویو لیا۔ میں نے بعد از انقلاب مسائل کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارا انقلاب ابھی جاری ہے۔ وہ ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا۔ مگر عجیب بات ہے کہ انقلاب کے ۱۷ سال بعد آج بھی ایرانی پروفیسر وہی زبان بول رہے ہیں۔ واضح ہو کہ ایران میں "اسلامی انقلاب" جنوری ۱۹۷۹ میں آیا تھا۔

تقریروں کے بعد سوال و جواب کا وقفہ تھا۔ لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے۔ ایک عرب نوجوان نے میری تقریر پر بولتے ہوئے کہا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ مگر امن محض امن کی باتیں کرنے سے قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کے قیام کی دو لازمی شرطیں ہیں رفع الظلم وتحقیق الحق۔ یعنی ظلم کو ختم کرنا اور حق کو قائم کرنا۔ پہلے ہم کو ظلم کا خاتمہ کرکے حق کو غالب کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی امن قائم ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ تشدد یا خوف کے ماحول میں کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا۔ امن کی ضرورت اس لئے ہے کہ امن سے کام کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ رفع ظلم یا اقامت حق کے لئے بھی اسی وقت کوئی مؤثر کوشش کی جا سکتی ہے جب کہ ماحول میں امن و امان کی فضا موجود ہو۔

جاپان کے ایک بدھسٹ نے میری تقریر پر سوال کیا کہ آپ نے کہا ہے کہ اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ہے۔ البتہ دفاعی جنگ ہے۔ مگر دفاعی جنگ سے آپ کی کیا مراد ہے۔ آجکل کے زمانہ میں ہر ملک میں ڈیفنس منسٹری ہوتی ہے۔ ایک ملک ڈیفنس کے نام پر دوسرے ملک سے جنگ چھیڑ دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ "دفاعی جنگ مخصوص شرطوں پر" اس کا مطلب یہ ہے کہ دفاعی جنگ بھی صرف اس وقت کی جاتی ہے جبکہ جنگ سے بچنے کی تمام ممکن کوشش ناکام ہو جائے۔ دشمن آپ کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ آپ کے لئے بچاؤ کی کارروائی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ گویا دفاع مجبورانہ جنگ کا نام ہے اور جارحیت اقدامی جنگ کا نام۔

ایک انٹرنیشنل مذہبی کانفرنس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے روم (اٹلی) کا سفر کیا۔ یہ کانفرنس ۷۔۱۰ اکتوبر ۱۹۹۶ کو تھی۔ اس موقع پر دو پیپر پیش کیے اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں، اس کانفرنس میں ۸۰ ملکوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ اس کی روداد ان شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

انگریزی اخبار راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر عمران احمد شاہ نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر فتویٰ اور قضا سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ سیاسی فتوے دینا اسلام کا اکسپلائیٹیشن ہے نہ کہ اسلام کی تعمیل۔

مالب (ہریانہ) میں ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ کو وہاں ایک افتتاحی جلسہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور وہاں مسجد کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ خلاصہ یہ تھا کہ مسجد دینی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس ادارہ کو اگر موثر طور پر زندہ کیا جائے تو وہ اصلاح ملت کا اہم ذریعہ بن جائے۔

سوادھیائے تحریک کے زیر اہتمام ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو بمبئی میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے شرکت کی۔ اور انسانی فلاح کے موضوع پر خطاب کیا۔ بمبئی میں اس کے علاوہ بھی کئی پروگرام ہوئے۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

صدر اسلامی مرکز نے اکتوبر ۱۹۹۶ کے آخری ہفتہ میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ وہاں جامعہ ریاض البنات اور جامعہ ریاض الاسلام اور مدینہ ایجوکیشنل سنٹر میں خطابات کے پروگرام ہوئے۔ اس سفر کی روداد اِن شاء اللہ سفرنامے کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو دہلی کے سیاسی لیڈر نے کچھ صحافیوں پر جارحانہ حملہ کیا تھا۔ اس موضوع پر نیشن اینڈ دی ورلڈ (انگریزی) کے نمائندہ نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ بتایا گیا کہ یہ واقعہ جمہوری روایات اور دستور ہند کے سراسر خلاف تھا۔ اگر بالفرض کسی صحافی نے کوئی زیادتی کی تھی تو مذکورہ لیڈر کو خود حملہ کرنے بجائے پولیس کو بلانا چاہیے تھا۔ ایک سوال کے

جواب میں کہا گیا کہ اس مسئلہ کا حل ایک نیا قانون بنانا نہیں ہے بلکہ لوگوں کے ذہن کو درست کرنا ہے۔
ہفت روزہ تیسرا راستہ کے زیر انتظام غالب اکیڈمی (نئی دہلی) میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: حالات حاضرہ اور صحافتی ذمہ داریاں، مسلم مسائل کے پس منظر میں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ مسلمانوں کو یہ شکایت اپنے دماغ سے نکال دینا چاہیے کہ ہندو پریس مسلمانوں کے بارہ میں متعصب ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندو پریس ہو یا مسلم پریس، دونوں تجارتی پریس ہیں۔ ہر ایک تجارتی مفاد کی بنیاد پر چلایا جاتا ہے نہ کہ تعصب یا غیر تعصب کی بنیاد پر۔

بھارتیہ ودیا بھون (نئی دہلی) میں ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: اچھی حکومت کیسے بنتی ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ پہلے ہم کو اچھا سماج بنانا پڑے گا اس کے بعد ہی وہاں اچھی گورنمنٹ بن سکتی ہے۔

ٹی وی ٹوڈے کی ٹیم نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو دور درشن کے لیے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ پورا انٹرویو اسلام پر تھا۔ اسلام کی تعلیمات کے مختلف پہلو قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائے گئے۔ یہ انٹرویو کئی قسطوں میں دور درشن کے صبح کے پروگرام میں دکھایا جائے گا۔

ڈولپنگ کنٹریز ریسرچ سنٹر (یو جی سی) کے تحت جہیز وغیرہ کے مسائل پر ایک ریسرچ کی جارہی ہے۔ اس سلسلہ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۹۶ کو مسز ناظمہ احمد نے ٹیلی فون پر اسلامی نقطۂ نظر جاننے کے لیے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ بتایا گیا کہ جہیز کی مروجہ شکل سراسر غیر اسلامی ہے۔ البتہ بلا مطالبہ اور غیر نمائشی طور پر سادہ قسم کی کچھ ضروری چیزیں دے دی جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک نئی کتاب زیر طبع ہے جس کا نام 'دین انسانیت' ہے۔ اس میں اسلام کو امن اور رحمت اور انسانیت کے دین کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

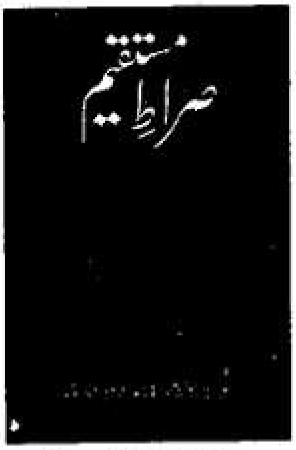
بعض مغربی ملکوں کے افراد کے تعاون سے الرسالہ انگریزی کو انٹرنٹ پر لایا جا رہا ہے۔ ان شاء اللہ اس کے بعد الرسالہ مشن کی عالمی اشاعت ممکن ہو سکے گی۔ اس کے ذریعہ ای میل کا طریقہ اختیار کر کے الرسالہ کے پیغام کو وسیع ترین شکل میں پھیلایا جا سکے گا۔

کیتھولک ورلڈ نیوز کے دہلی کے نمایندہ مسٹر اینٹو اکارا نے ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۶ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بعض صدیوں کے آیندہ الکشن سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ الکشن سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری سیاست نیشنل اشوز سے ہٹ کر ذیلی اشوز کی طرف چلی گئی ہے۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔ ضرورت ہے کہ الکشنی سیاست کو دوبارہ نیشنل اشوز کی طرف لایا جائے۔

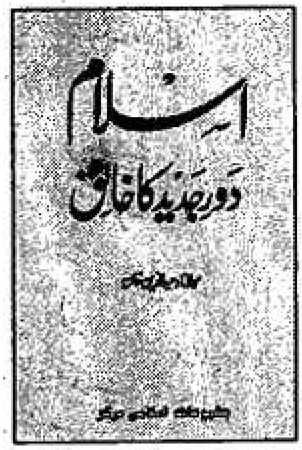
انگریزی اخبار ہندڈے کی خاتون نمایندہ اسماء عرشی نے یکم نومبر ۱۹۹۶ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تعدد ازواج سے تھا۔ اس سلسلہ میں انھیں اسلام کا قانون بتایا گیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں اس کا ریلیونس باقی ہے۔ جواب دیا گیا کہ اس اجازت کا تعلق زمانہ سے نہیں ہے بلکہ عورتوں کے سرپلس ہونے سے ہے۔ اور وہ ایک غیر زمانی ظاہرہ ہے۔

ڈاکٹر رجنی پانی (ڈائرکٹر ساوتھ ایشین سنٹر، لانگ آئیلنڈ یونی ورسٹی) نے ۲ دسمبر کو دو امریکن اسکالر کے ساتھ صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ یہ لوگ اسلامی تصوف پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کو اس موضوع پر ضروری معلومات دی گئیں اور کچھ انگریزی کتابیں مزید مطالعہ کے لیے دی گئیں۔

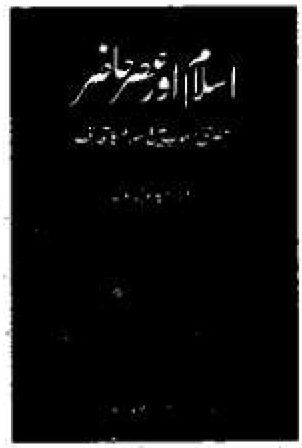
۶ جنوری ۱۹۹۷ کو بمبئی (چوہان اڈیٹوریم) میں ایک خصوصی فنکشن ہوا۔ اس میں بمبئی کے تعلیم یافتہ اور صنعت کار طبقہ کے لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذہبی رواداری کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اور بعض دوسرے پروگراموں میں شرکت کی۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔



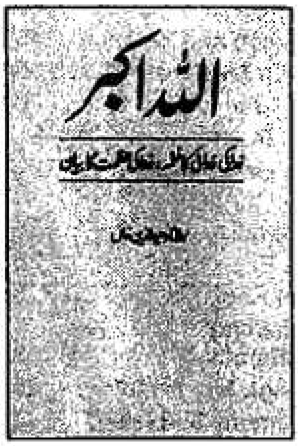
Size 22x14.5cm,
200 pages
Rs. 40



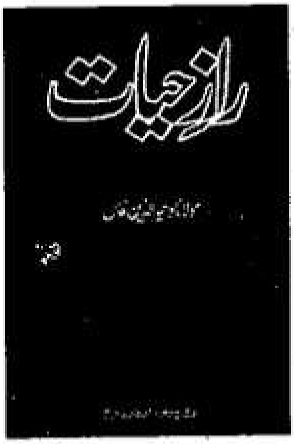
Size 22x14.5cm,
112 pages
Rs. 25



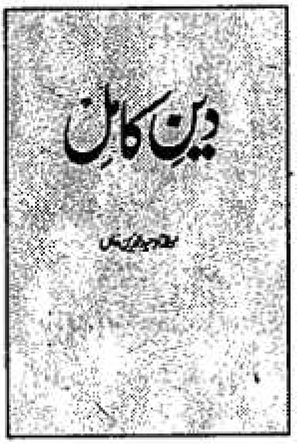
Size 22x14.5cm,
144 pages
Rs. 30



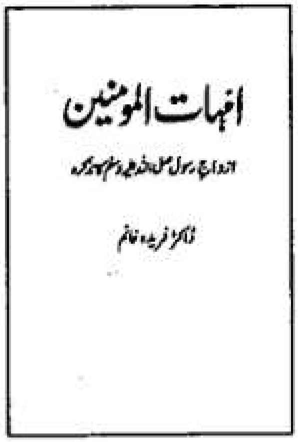
Size 22x14.5cm,
288 pages
Rs. 45



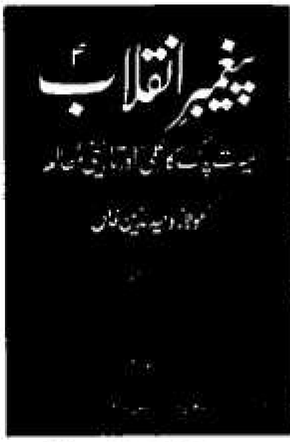
Size 22x14.5cm,
292 pages
Rs. 50



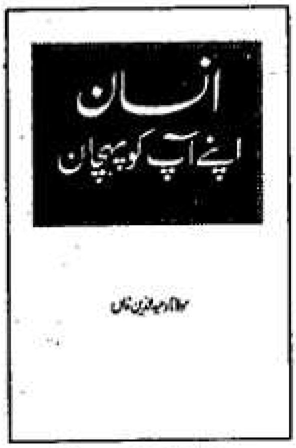
Size 22x14.5cm,
368 pages
Rs. 60



Size 22x14.5cm,
56 pages
Rs. 20



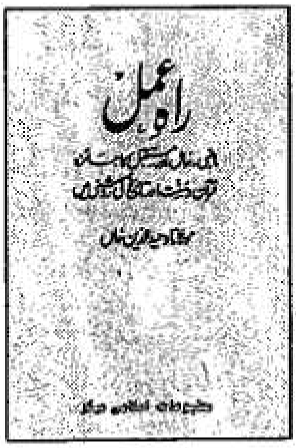
Size 22x14.5cm,
208 pages
Rs. 40



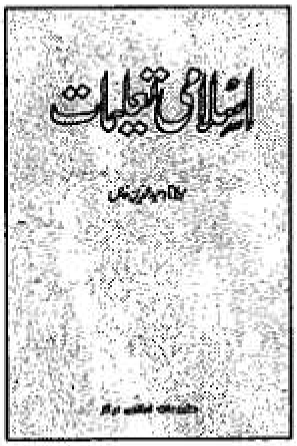
Size 22x14.5cm,
24 pages
Rs. 5



Size 22x14.5cm,
344 pages
Rs. 70



Size 22x14.5cm,
152 pages
Rs. 25



Size 22x14.5cm,
144 pages
Rs. 25

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet of Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	7/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Presenting the Qur'an	165/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
Treasury of the Qur'an	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	—
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
طلاق اسلام میں	3/-
تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	8/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
فکرِ اسلامی	50/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	45/-
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	9/-
اسلام کا تعارف	3/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدّیٰ (عربی)	85/-

هندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بھوپتی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوشیہ	8/-
پوتر جیون	8/-
منزل کی اور	3/-

آڈیو کیسٹ

	Rs.
حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریق کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعمیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

الرسالہ

